رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ
مارچ ۲۰۲۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

درس آیتِ بِسمِ اللہ
بانیِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعلّم و تعلیمِ قرآن: کیوں اور کیسے؟

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:
مختصر بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی
امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ دیدہ زیب مضبوط جلد ❁ 1248 صفحات
خصوصی رمضان پیکج
-/4500 روپے کے بجائے
صرف -/2200 روپے میں
فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ
مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 74

شمارہ : 3

رمضان المبارک 1446ھ

مارچ 2025ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون: 500روپے

اس شمارے کی قیمت 100روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

رضاء الحق، ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org ' 0301-1115348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

ٹرمپ: رسّی جل گئی مگر بل نہیں گیا! — رضاء الحق

درسِ قرآن 9

درس آیت بسم اللہ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رجوع الی القرآن 29

تعلّم و تعلیمِ قرآن: کیوں اور کیسے؟ — پروفیسر ڈاکٹر نجیب الحق

ہماری دعوت 44

قرآن: کتابِ ہدایت و انقلاب — ڈاکٹر ضمیر اختر خان

تزکیہ و تربیت 55

تلاوتِ قرآن اور اُسوۂ صحابہؓ — ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

انوارِ ھدایت 65

رمضان المبارک: نیکیوں کی نشوونما کا موسم بہار — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

دعوتِ فکر 69

رمضان کیسے گزاریں؟ — خورشید انجم

حکمتِ دین 73

روزے کے روحانی و طبّی فوائد — احمد علی محمودی

دعوت و تحریک 81

نفاذِ شریعت کے لیے طریق کار پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور مفتی محمد تقی عثمانی کا اتفاق — انجینئر نوید احمدؒ

رمضان اور قرآن 91

دورۂ ترجمہ قرآن کی مختصر تاریخ — عبدالرؤف

اقبالیات 100

علّامہ اقبال کی وابستگیٔ رسولؐ — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

اقبال کا فلسفہ خودی — ڈاکٹر ابصار احمد 115

تذکیر و موعظت 124

اُمّتِ مُسلمہ کی زبوں حالی کا علاج — حافظ محمد اسد

اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیت: اعتدال اور میانہ روی — مولانا عبدالمتین 129

افکار و آراء 140

عمر رسیدہ افراد کے لیے لمحۂ فکریہ — ممتاز ہاشمی

ظروف و احوال 143

مسلمانانِ ہند کا مقدمہ — ارسلان اللہ خان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ٹرمپ: رسّی جل گئی مگر بل نہیں گیا!

امریکی صدر ٹرمپ کو دوبارہ اقتدار میں آئے ہوئے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا کہ اُن کی یادداشت سے وہ تمام دعوے اور بیانات محو ہو گئے ہیں جو اُنہوں نے الیکشن جیتنے کے لیے کیے تھے‘ خصوصاً عالمی امن کے حوالے سے۔ اُن کا تازہ بیان ہے کہ تمام اسرائیلی یرغمالیوں کو ’’اگر ہفتہ کے دن ۱۲ بجے تک رہا نہ کیا گیا تو غزہ سیز فائر ختم ہو جائے گی۔‘‘ اِس سے قبل اُن کا یہ بیان بھی زیرِ بحث رہا ہے کہ ’’جنگ ختم ہونے کے بعد اسرائیل غزہ کا علاقہ امریکا کے حوالے کر دے گا‘‘ اور ’’غزہ کی تعمیرِ نو امریکا کرے گا اور امریکی اقدامات سے غزہ میں استحکام آئے گا۔‘‘ اِن بیانات کے پیشِ نظر عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ پوری دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہے کہ کیا دنیا پھر ایک اور جنگ کی تباہ کاریاں دیکھے گی! اہلِ دانش میں سے ایک گروہ تو گزشتہ کئی سال سے کہہ رہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہو چکی ہے جبکہ بعض کا خیال اِس کے برعکس ہے۔ جنگ عالمی ہو یا محدود‘ اُس کی تباہ کاریوں اور مضر اثرات سے بہرحال پوری دنیا کے عوام متاثر ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک کی معیشت کا تو دارومدار ہی اسلحہ کی تجارت پر ہے۔ گویا دنیا کے کسی خطے میں امن قائم ہونا اُن کی اپنی موت کے مترادف ہے۔ ۷/ اکتوبر ۲۰۲۳ء سے قبل اسرائیل فلسطین کے نہتے مسلمانوں پر ظلم و ستم کرتے ہوئے نہ صرف اُن کے علاقوں پر جبری قبضہ کر چکا تھا بلکہ کئی اسلامی ممالک بھی اُس قبضے کو قانونی ماننے کو تیار تھے۔ اِس سے قبل کہ یہ سب کچھ قانونی قرار دے دیا جاتا‘ حماس نے ’’تنگ آمد بجنگ آمد‘‘ کے مصداق اسرائیل پر زمینی حملہ کر کے دنیا بھر کو اس کے مذموم ارادوں سے باخبر کر دیا۔ اُس وقت دنیا بھر میں بڑی تعداد میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ آج نہیں تو کل حماس کو اِس عظیم غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اسرائیل نے حماس کو ختم کرنے اور اس کی قید میں اپنے فوجیوں کی رہائی کے لیے اپنی پوری توانائی استعمال کی مگر نہ تو وہ اپنے قیدیوں کو واپس لے سکا اور نہ ہی حماس کو ختم کر سکا۔ اِس

سے انکار نہیں ہے کہ جنگ میں حماس کو جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ غزہ کا تمام تر انفراسٹرکچر تباہ ہو گیا۔ سکول کالجز‘ ہسپتال‘ شاپنگ مالز حتیٰ کہ پانی کے ذخائر تک تباہ کر دیے گئے۔ کم و بیش پچاس ہزار خواتین‘ بچے‘ بوڑھے‘ جوان سمیت کئی بڑے رہنما شہید ہو گئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد زخمی ہو گئے‘ جن کے علاج کے لیے نہ کوئی معالج دستیاب ہے اور نہ ہی ہسپتال۔ بمباری سے شہید ہو جانے والے مسلمانوں کی لاشیں ابھی تک ملبے سے نکالی جا رہی ہیں۔ تاہم‘ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن شہادتوں اور قربانیوں کے طفیل ہی تو اسرائیل کو جنگ بندی کا اَمن معاہدہ کرنا پڑا۔ حماس کے ساتھ اسرائیل کے اِس اَمن معاہدے کو اگر اسرائیل کا غیر رسمی اعلانِ شکست کہا جائے تو غلط نہ ہوگا‘ کیونکہ نہتے فلسطینیوں نے دنیا کے بہترین اور مہنگے اسلحہ کی ساکھ ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔ اسی ساکھ اور دھاک کے بل بوتے پر تو اُس نے اہلِ فلسطین ہی نہیں بلکہ پورے خطہ عرب کو بھی مرعوب کر کے رکھا ہوا تھا۔ اِس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جنگیں تو لڑی ہی ساکھ اور دھاک کو بچانے کے لیے جاتی ہیں۔ اِس جنگ سے پہلے حماس کی نہ تو کوئی ساکھ تھی اور نہ ہی دھاک کہ جس کے تحفظ کے لیے اُسے جنگ لڑنا پڑی۔ اِن حالات میں یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ جنگ بندی کی اصل ضرورت اسرائیل اور اُس کی حامی افواج کو تھی۔ حماس کے پاس اسرائیل کے وہ چند فوجی قید تھے کہ جن کے تبادلے میں اسے اپنے ہزاروں قیدی واپس مل گئے۔ جن تین قیدیوں کے حوالے سے صدر ٹرمپ کو دھمکی آمیز بیان دینا پڑا وہ بھی حماس نے اپنی شرائط پر ہی چھوڑنے کی بات کی۔ گویا امن ہو یا جنگ‘ فلسطینیوں کو اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا‘ کیونکہ وہ تو اپنے وطن سے زیادہ ارضِ مقدس کے تحفظ کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ جنگ بندی کے حوالے سے اسرائیل پر اپنے عوام کی طرف سے بھی خاصا دباؤ رہا ہے جسے وہ کسی خاطر میں نہیں لاتا مگر موقع کی نزاکت کے حوالے سے اُسے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا ہے۔

صدر ٹرمپ کے بیانات سے یہ بات تو کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ ماضی میں اسرائیل کے تمام تر اقدامات کے پس پردہ امریکہ ہی تھا۔ ارضِ فلسطین پر امریکی جنگ لڑنے کی ذمہ داری اسرائیل پر اُسی طرح تھی جیسے افغانستان میں امریکی جنگ لڑنے کی ذمہ داری پاکستان پر تھی۔

اب خود کو امن کا پیغامبر کہلوانے والا ٹرمپ ارضِ فلسطین میں امن قائم کرنے کا ڈرامہ

رچانے کے بعد اپنی مرضی سے ایک نئی جنگ چھیڑنے کو ہے۔ واضح رہے کہ غزہ ہو یا افغانستان‘ دونوں جگہ سے امریکہ بظاہر امن کا نام لے کر ہی نکلا ہے مگر حقیقت میں سخت ہزیمت اُٹھا کر اور رسوا ہو کر نکلا ہے۔ ’’رسّی جل گئی مگر بل نہیں گیا‘‘ کے مصداق سخت ہزیمت اُٹھانے کے بعد بھی وہ دونوں جگہ پر نئی جنگ کے لیے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ غزہ میں حالیہ جنگ بندی سے جہاں اسرائیل کو سانس لینے کا موقع ملا ہے‘ اُس سے کہیں زیادہ فلسطینیوں کو تازہ دم ہونے کا وقت ملا ہے۔ فلسطینیوں کے پاس گنوانے کو پہلے بھی کچھ نہیں تھا اور اب بھی کچھ نہیں ہوگا جبکہ امریکی صدر کے بیان کے بعد آئندہ اسرائیل کے ساتھ امریکہ بھی اپنی ساکھ ضرور گنوائے گا۔ امریکی کانگریس کے رُکن آل گرین نے کہا ہے کہ اگر ٹرمپ نے غزہ میں کوئی اپنا منصوبہ شروع کیا تو اُس کے خلاف مواخذے کی کارروائی شروع کر دی جائے گی۔ اس سب کے باوجود امریکی صدر کے بیانات کو غیر سنجیدہ نہیں لیا جا سکتا۔ اس بیان کے فوراً بعد ہی اسرائیلی وزیر دفاع کاٹز نے کہا کہ میں صدر ٹرمپ کے دلیرانہ منصوبے کا خیر مقدم کرتا ہوں‘ غزہ کے رہائشیوں کو آزادی سے ہجرت کی اجازت ہونی چاہیے جیسا کہ دنیا بھر میں قوانین ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے فلسطینیوں کو زمینی‘ سمندری اور فضائی راستوں کے ذریعے غزہ کی پٹی سے نکالنے کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے اپنی فوج کو احکامات بھی جاری کر دیے ہیں۔

صدر ٹرمپ کو اپنے اِس اعلان پر عالمی برادری کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ حماس نے کہا ہے کہ غزہ پٹی کے رہائشی کسی بھی قیمت پر اپنی سرزمین سے دستبردار نہیں ہوں گے‘ اِس کا انتظام چلانے کے لیے اُنہیں کسی دوسرے ملک کی ضرورت نہیں۔ چین نے بھی امریکی صدر ٹرمپ کے بیان کی مخالفت میں کہا ہے کہ فلسطین پر فلسطینیوں کی حکمرانی بنیادی اصول ہے‘ وہ غزہ کے باشندوں کی جبری منتقلی کے خلاف ہے۔ ایران نے ٹرمپ کے بیان کو غزہ پر قبضے کی منصوبہ سازی قرار دیا اور کہا کہ ایران غزہ سے فلسطینیوں کی کسی بھی طرح کی بے دخلی کو مسترد کرتا ہے۔ ترکیہ کے صدر رجب طیب اردوان نے کہا کہ کسی کے پاس بھی غزہ کے لوگوں کو اُن کی زمین سے نکالنے کا اختیار نہیں۔ غزہ کے لوگ غزہ میں رہیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے۔

اقوام متحدہ کے ترجمان اسٹیفن ڈوجارک نے زبردستی نقل مکانی کو ’’نسلی تطہیر‘‘ کے مترادف قرار دیا‘ جبکہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس نے کہا کہ فلسطینیوں کو اُن کے

آبائی وطن سے جبری طور پر بے دخل کرنا بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایسے بیانات سے حالات مزید خراب اور پیچیدگی کی طرف جا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم فلسطین کے دو ریاستی حل کی حمایت کرتے ہیں۔ غزہ کے مسئلے کا پُرامن اور مستقل حل تلاش کیا جائے اور اس کے لیے سب کو بین الاقوامی قوانین کا احترام کرنا ہوگا۔ مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں اُسے مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم بین الاقوامی قانون کی بنیادوں پر عمل پیرا رہیں اور نسلی صفائی کی کسی بھی صورت سے بچیں۔ ہمیں دو ریاستی حل کے لیے مذاکرات دوبارہ شروع کرنا ہوں گے۔ واضح رہے کہ ہمارے اور اہلِ غزہ کے نزدیک اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ فلسطین میں صرف اور صرف مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے جس کا دارالحکومت یروشلم ہو۔

صدر ٹرمپ کے بیان پر دنیا بھر سے موصول ہونے والے شدید ردِّعمل کے بعد وائٹ ہاؤس کی ترجمان کیرولائن لیوٹ کہنے پر مجبور ہوگئیں کہ امریکی صدر کا غزہ میں امریکی فوج بھیجنے کا ارادہ نہیں ہے۔ وہ خطے میں استحکام کے لیے غزہ کی تعمیرِ نو کے لیے پُرعزم ہیں اور وہاں سے فلسطینیوں کی عارضی منتقلی چاہتے ہیں‘ جس کے لیے امریکا کی شمولیت ضروری سمجھتے ہیں۔ اِس کے بعد ٹرمپ نے ایک اور بیان میں کہا کہ وہ غزہ کو خریدنے اور اس کی ملکیت کے بیان پر قائم ہیں۔ وہ فلسطینیوں کا خیال رکھیں گے‘ اُن کا قتل نہیں ہونے دیں گے۔ جب وہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک‘ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان اور مصر کے صدر سیسی سے بات چیت کریں گے اور صدر پیوٹن سے مناسب وقت پر ملاقات ہوگی تو وہ فلسطینیوں کو اپنے ہاں بسانے پر تیار ہو جائیں گے۔

بے شک ٹرمپ بہت کائیاں ہیں۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا کہ وہ ایک غیر روایتی امریکی صدر ہیں۔ وہ کام بھی کرتے ہیں جو نہیں کہتے اور جو کہتے ہیں وہ تو ضرور کرتے ہیں۔ دنیا اُن کی تقریروں کو محض بیانات خیال کر رہی ہے جبکہ وہ ایک ماہر پہلوان کی طرح مناسب داؤ کی تلاش میں ہیں۔

ماضی میں امریکی صدر جمی کارٹر اسرائیلی صدر بیگن اور مصری صدر انور سادات کو بظاہر ایک امن معاہدے کے ذریعے پابند تو کر گئے تھے مگر اُس معاہدے کا بھی اصل فائدہ فریقین یا خطے کے بجائے امریکہ ہی کو ہوا۔ اِن حالات میں مسلم ممالک کے حکمرانوں کے ساتھ پاکستان کے مقتدر حلقوں کو بھی چاہیے کہ ٹرمپ یا ہوگھ جوڑ اور صہیونیوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔

(باقی صفحہ 64 پر)

درس آیت بسم اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مبنی ''بیان القرآن'' کی سلسلہ وار اشاعت ''میثاق'' کے گزشتہ شمارے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک! زیرِنظر شمارے سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے مفصل دروسِ قرآن کی اشاعت کا آغاز کیا جا رہا ہے جو ۱۹۹۱ء میں قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہوئے۔ اس سلسلے کا پہلا درس (آیت بسم اللہ) ہدیۂ قارئین ہے۔

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم ــــ اَمَّا بَعۡدُ:

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہم اللہ تعالیٰ کی تائید‘ توفیق اور بھروسے پر اعتماد کرتے ہوئے قرآن حکیم کے ابتدا سے سلسلہ وار دروس شروع کر رہے ہیں۔ یہ قرآن حکیم ہے لیکن ٹیکنیکل اصطلاح میں جو کتاب میرے سامنے ہے‘ اِسے ''مصحفِ عثمانؓ'' کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جمعہ کے خطبوں میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''جامعُ آیاتِ القُرآن'' کے الفاظ کہہ دیے جاتے ہیں‘ جس کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں کچھ مغالطے موجود ہیں۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ غیر شعوری طور پر قرآن حکیم سے سوءِ ظن اور بے اعتمادی کی ایک فضا بھی موجود ہے۔ چنانچہ عام طور پر اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ قرآن مجید کو پہلی مرتبہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا۔ یہ بات بہت بڑا مغالطہ اور بہت بڑی

گمراہی کی بنیاد ہے‘ اس لیے کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے لگ بھگ پندرہ برس بعد قرآن مجید جمع ہوا۔ چاہے ہم اپنے جامد اعتقاد کی وجہ سے کچھ نہ کہتے ہوں لیکن تحت الشعور میں ایک شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا پندرہ سال یا بارہ سال اس صورت میں گزرے کہ قرآن مرتّب شکل میں موجود نہ تھا! یہ اصل میں ان الفاظ ہی کا پیدا کردہ مغالطہ ہے۔

جمع وتدوینِ قرآن کے مراحل

اس حوالے سے یہ حقیقت جان لیجیے کہ قرآن مجید کی ترتیب خود محمد رسول اللہ ﷺ نے مکمل فرما کر اسے اُمّت کے حوالے کیا تھا۔ یہ وہ بات ہے جس کا وعدہ بالکل ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا تھا۔ جب قرآن مجید کی تنزیل شروع ہوئی تو حضور ﷺ خصوصی مشقت کے ساتھ اس کو یاد کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شفقت اپنے نبی ﷺ کے لیے جوش میں آئی اور حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ (القیامۃ)

''(اے نبی ﷺ!) آپ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں اس قرآن کے ساتھ کہ جلدی سے اس کو یاد کر لیں۔ یقیناً اس کو جمع کرنا اور پھر اس کو پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

گویا وہ اندیشہ نبی اکرم ﷺ کے ذہن سے اتار لیا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں اس قرآن کی کوئی آیت بھول جاؤں۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لے لی‘ جیسے کہ قرآن مجید کی ہمیشہ ہمیش کے لیے حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

اسی طرح ابتدا ہی میں اس کو جمع کر کے پڑھوا دینے کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود لے لی۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر رمضان المبارک میں نبی اکرم ﷺ

اور حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن مجید کا مذاکرہ (باہمی دہرائی) فرمایا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ماہ رمضان المبارک میں دو مرتبہ دہرائی کی گئی۔ (۱) پھر یہ کہ ہمیں دورِ نبویؐ ہی میں ''حزب'' جیسی اصطلاحات ملتی ہیں۔ اگر فی الواقع قرآن مرتّب نہ ہوا ہوتا تو یہ احزاب کیسے بن سکتے تھے؟ چنانچہ یہ جو خیال ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے اس کی اصل حقیقت کو جان لیجیے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں قرآن مرتّب ہو چکا تھا' لیکن ایک مجلّد کتاب کی صورت میں (ما بین الدُّفَّتین یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان) موجود نہیں تھا۔ آیتیں سورتوں کی شکل میں مرتّب ہو چکی تھیں۔ سورتوں کی باہمی ترتیب معیّن ہو چکی تھی۔ اسی ترتیب کے ساتھ قرآن مجید کو نمازوں میں پڑھا جاتا تھا۔ رمضان المبارک میں خود رسول اللہ ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ اسی ترتیب سے اس کا مذاکرہ فرماتے تھے' البتہ قرآن مجید کسی یکجا مجلد کتاب کی صورت میں دورِ نبویؐ میں موجود نہیں تھا۔ جمع قرآن کا یہ مرحلہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت تک ملتوی نہیں ہوا' بلکہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں یہ کام ہو گیا تھا' اس لیے کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حُفّاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے تو ایک بڑی تشویش پیدا ہوئی۔

یہ جان لیجیے کہ اصل میں یہ قرآن ''لوحِ محفوظ'' میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝۲۱ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۲۲﴾ (البروج) ''بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے' اس لوح میں نقش ہے جو محفوظ ہے۔'' لوحِ محفوظ کو دوسری جگہ پر ''کتابِ مکنون'' کہا گیا ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝۷۷ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝۷۸ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹﴾ (الواقعة) ''یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے' ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے' جسے مطہّرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔'' بہرحال اس کی پہلی جمع و تدوین لوگوں کے سینوں میں ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ﴾

(۱) ملاحظہ ہو: صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب کان جبریل یعرض القرآن علی النبی ﷺ۔

(العنکبوت: ۴۹) ''بلکہ یہ تو روشن آیات ہیں' ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔'' اس کے بعد کتابی شکل میں اس کی تدوین ہوئی اور اس کو مجلّد کتاب کی صورت میں مرتّب کرنے کا کام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوا۔ اس ضمن میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ جب بہت سے صحابہؓ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس کی ضرورت کا احساس دلایا تو انہیں تأمل تھا کہ جب یہ کام رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں نہیں کیا تو میں کیسے کروں! چونکہ مقامِ صِدّیقیت مقامِ نبوت سے بہت نزدیک اور بہت ملحق ہوتا ہے' تو اتباعِ کامل کی شکل ہمیں حضرت ابوبکر صِدّیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو اس پر اطمینان نہ تھا۔ لیکن پھر جب وہ واقعات اور شواہد سامنے آئے اور صحابہؓ کا اس پر تقریباً اجماع ہوا تو آپؓ کے حکم پر تمام کاتبینِ وحی کو جمع کیا گیا' خاص طور پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس خدمت پر مامور کیا گیا اور انہوں نے قرآن مجید کے مختلف اجزاء جمع کیے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کسی کے پاس کوئی سورت اونٹ کے شانے کی ہڈی پر لکھی ہوئی تھی' کسی کے پاس کاغذوں پر اور کسی کے پاس کپڑوں پر لکھی ہوئی کچھ سورتیں تھیں۔ البتہ سینوں میں مکمل قرآن اسی ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ بہرحال مکتوب حالت میں یہ جو اجزاء تھے ان کو جمع کیا گیا اور ''ما بین الدُّفَّتین'' قرآن مجید کی جمع و تدوین کا یہ کام عہدِ خلافتِ صدیقیؓ کے اندر مکمل ہو گیا۔

حضرت عثمانؓ: جامعُ الأُمَّةِ علی القرآن

اس کے بعد دوسرا مرحلہ لہجوں کے فرق کا درپیش تھا۔ ہر ملک میں' خواہ زبان ایک ہی ہو' پھر بھی لہجے بہت سے ہوتے ہیں۔ خود پنجابی زبان کا لہجہ ہر پچاس میل پر بدل جاتا ہے۔ اسی طرح لوگ لہجوں کے فرق کے ساتھ قرآن کو پڑھتے تھے اور لہجوں کے اسی فرق کی وجہ سے قرآن کے لکھنے میں بھی فرق پیدا ہو رہا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ لہجوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ جو لکھنے کے اندر کچھ فرق پیدا ہو رہا ہے' یہ بھی بعد میں کسی بہت بڑے فتنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا پوری اُمّت کو ایک ''مصحف'' پر جمع کرنا آپؓ کا کارنامہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ''جامِعُ

آیاتِ القرآن ‘‘ کے الفاظ ہی غلط ہیں۔ وہ تو ’’جامِعُ الاُمَّۃِ علی القرآن ‘‘ یعنی اُمّت کو قرآن پر جمع کرنے والے ہیں۔

آپؓ نے قرآن مجید کا وہ نسخہ منگوایا جو اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور اس کو ’’مصحفِ عثمان‘‘ کی شکل دے دی گئی۔ اسی مصحف کی بڑے پیمانے پر نقلیں کرائی گئیں اور تمام بڑے بڑے شہروں کو بھیجا گیا۔ یہی مصحفِ عثمان ہے جو اَب پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ باقی جو ذرا ذرا فرق نظر آتا ہے وہ رسمِ کتابت کا ہے جس سے تلاوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کے بعد جو نسخے بچے تھے انہیں جمع کر کے آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طریقے سے یہ مصحفِ عثمان پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اسی کی ہم سب تلاوت کرتے ہیں اور یہی پوری اُمّت کے پاس قرآن مجید کا متفق علیہ نسخہ ہے۔

سورتوں کے آغاز میں آیت بسم اللہ کی حیثیت

اس تمہید کے بعد آج ہمیں صرف آیت ’’بسم اللہ‘‘ پر غور کرنا ہے۔ یہ آیہ مبارکہ قرآن مجید کی سورتوں میں سے صرف ایک سورت سورۃ النمل میں آئی ہے اور وہ اس خط کے آغاز میں ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو لکھا تھا۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۳۰﴾ (النمل)

’’یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا آغاز ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔‘‘

اس طرح بسم اللہ کے الفاظ ایک سورت کے درمیان میں بطور آیت وارد ہو گئے ہیں۔ ویسے قرآن حکیم کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۱۱۳ سورتوں کے آغاز میں یہ آیت لکھی جاتی ہے‘ صرف ایک سورت سورۃ التوبہ (دوسرا نام البراءۃ) کے شروع میں آیت بسم اللہ درج نہیں ہوتی۔ اس میں اب قراء اور فقہاء کا اختلاف ہے کہ: ۱۱۳ سورتوں کے آغاز میں جو آیت بسم اللہ لکھی ہوئی ہے‘ آیا یہ تمام سورتوں کا جزو قرار پائے گی؟ یا اس کو ہر سورت کا جزو تو نہیں مانا جائے گا‘ البتہ قرآن مجید کی آیات کی گنتی کرتے ہوئے ان ۱۱۳ آیات کو بھی شمار کیا جائے گا؟ یا یہ کہ نہ یہ ان سورتوں کا جزو ہے نہ یہ شمار میں آئیں گی‘ بلکہ یہ صرف

سورتوں کے فصل کے طور پر بطور علامت درج ہیں‘ کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں ایک سورت ختم ہو گئی ہے اور دوسری سورت شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ مختلف آراء موجود ہیں۔

اس ضمن میں امام شافعیؒ اور ان کے شاگردوں کی رائے یہ ہے کہ ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ لکھی ہوئی ہے وہ اس سورت کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نماز میں جب سورۃ الفاتحہ کی جہری قراءت کی جاتی ہے تو اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوتا ہے‘ اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ آیت سورۃ الفاتحہ کا جزو ہے اور بقیہ تمام سورتوں کا بھی جزو ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کی رائے یہ ہے کہ سورتوں کے شروع میں درج بسم اللہ کسی بھی سورت کا جزو نہیں ہے‘ اور یہ بطور علامتِ فصل درج کی جاتی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں ایک سورت ختم ہو گئی اور دوسری سورت شروع ہو گئی۔

بسم اللہ کے شروع میں ایک لفظ کو محذوف مانا جاتا ہے: اَشْرَعُ ’’میں شروع کرتا ہوں‘‘: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ’’اللہ کے نام سے جو رحمان ہے اور رحیم ہے۔‘‘ ’’باء‘‘ حرفِ جار ہے اور اس کے بعد جو لفظ آیا ہے اسے اگر علیحدہ لکھا جائے تو ’’اسم‘‘ لکھیں گے‘ لیکن جب ’’بِ‘‘ اس کے ساتھ آ کر جڑی ہے تو ہمزۂ وصل گر گیا۔ اس طرح بِاسْم کے بجائے بِسْم بن گیا۔ اس لفظ ’’اسم‘‘ کو بھی سمجھ لیجیے‘ ویسے یہ معروف ہے‘ جانا پہچانا لفظ ہے۔ اسم کے معنی نام کے ہوتے ہیں‘ لیکن یہ کہ اس کی جڑ کیا ہے؟ یہ کہاں سے نکلا ہے؟ اس کا مادہ ہے: سین‘ میم اور واؤ۔ اسی سے لفظ ’’سماء‘‘ بنا ہے۔ ’’سمو‘‘ کہتے ہیں بلندی کو اور ’’سماء‘‘ کا معنی بھی بلندی ہے۔ بلندی چونکہ نمایاں ہوتی ہے لہٰذا کسی بھی شے کا وہ وصف جو بہت نمایاں ہو اور جس سے اس کی پہچان ہو جائے وہ اس کا ’’اسم‘‘ قرار پاتا ہے۔ کوئی بھی چیز جس وصف سے پہچان میں آ جائے‘ جس سے اس کا تعارف ہو جائے وہ اس کا اسم کہلاتا ہے۔

لفظ ’’اللہ‘‘: مشتق یا جامد؟

یہاں اللہ تعالیٰ کے تین اَسماء آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے لفظ ’’اللہ‘‘ ہے۔ یہ قرآن

مجید میں بھی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال نام ہے۔(۲) اس کے بارے میں ہمارے ہاں ایک بڑا بنیادی اختلاف ہے۔ بعض محققین اور صوفیاء کی اکثریت کا رجحان یہ ہے کہ لفظ ''اللہ'' اسمِ جامد ہے' یہ کسی اور لفظ سے نہیں نکلا۔ گویا کہ یہ مشتق نہیں ہے' بلکہ یہ اسمِ عَلم ہے۔ اسمِ عَلم وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کی علامت کے طور پر نام رکھ دیا جائے۔ جیسے لفظ ''لاہور'' کہاں سے نکلا' اس پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ لاہور تو بس ایک شہر کا نام ہے' اسمِ عَلم ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ لفظ ''اللہ'' کو ذاتِ باری تعالیٰ کا اسمِ ذات قرار دیتے ہیں اور باقی تمام ناموں کو صفاتی نام قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے طرزِ عمل سے بھی مطابقت رکھتی ہے' اس لیے کہ پھر اسم ذات ہی کا ذکر ان کے ہاں اشغال اور سلوک میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ (المزمل:۸' الانسان:۲۵) ''اور اپنے رب کے نام کو یاد کرو۔'' ان کی رائے میں کوئی نام ایسا ممتاز ہونا چاہیے جسے اللہ کی ہستی کا اسمِ ذات قرار دیا جا سکے (اور اس نام کی مالا جپی جائے)۔ غالباً اسی ذوق اور اسی رجحان کی وجہ سے اُن کی رائے یہ بنی کہ لفظ اللہ اسم جامد ہے' مشتق نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ عَلم ہے۔ اسمِ ذات ہے اُس ہستی کا جو اِس کائنات کی خالق' مالک اور ربّ ہے۔

البتہ ایک دوسری رائے پر اہلِ نحو کا تقریباً اجماع ہے کہ وہ اس نام کو بھی ایک صفاتی نام قرار دیتے ہیں اور اسے بھی مشتق مانتے ہیں' جیسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دیگر تمام صفاتی نام کسی اسم نکرہ' اسم صفت پر الف لام داخل کر کے بنے ہیں۔ ''رحمان'' مبالغے کا صیغہ ہے (جیسے فَعلان' غَضبان' سَکران' جَوعان' عَطشان) جب الف لام لگ گیا تو الرَّحمٰن ہوا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام بن گیا۔ ''رَحِیم'' صفت مشبہ کا صیغہ ہے' مراد ہے وہ ہستی جس میں صفتِ رحمت مستقل پائی جائے۔ اس پر الف لام داخل ہوا تو ''الرَّحِیم'' بن گیا۔ اس طرح یہ اللہ کا صفاتی نام ہو گیا۔ ''حَیّ'' زندہ' صاحبِ حیات۔ اس پر الف لام داخل ہوا تو ''اَلْحَیّ'' ہو گیا۔ اس طرح یہ اللہ کا صفاتی نام ہو گیا۔ لہٰذا اللہ

(۲) ''المعجم المفهرس لالفاظ القرآن الکریم'' کے شمار کے مطابق قرآن مجید میں لفظ ''اللہ'' ۹۸۰ دفعہ آیا ہے۔

تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں وہ سب صفاتی ہیں یعنی اسم نکرہ پر الف لام داخل کر کے ''معرّف باللّام'' کر کے انہیں اللہ کا صفاتی نام بنایا گیا۔ اہلِ نحو کی رائے یہ ہے کہ بالکل اسی طرح لفظ ''اِلٰہ'' پر الف لام داخل ہوا تو ''الالٰہ'' بن گیا اور بیچ میں سے الف حذف ہو گیا تو ''اللہ'' بن گیا۔ اس طرح یہ بھی درحقیقت مشتق نام ہے اور ''الف لام'' کے داخل ہونے سے اسم معرفہ بنا ہے۔ البتہ یہ بات اہلِ نحو بھی مانتے ہیں کہ اب لفظ ''اللہ'' بطور اسمِ عَلم استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان میں قاعدہ یہ ہے کہ اسم نکرہ پر اگر ''یائے ندا'' داخل کی جائے تو رحیم سے یا رحیم' علیم سے یا علیم بولا جائے گا' لیکن الف لام والے جو اَسماء ہیں اُن پر ''یا'' براہِ راست نہیں لگ سکتا' بلکہ ''یاایُّھَا'' کہنا پڑتا ہے۔ جیسے انسان سے ''یاانسان'' اور جب الف لام لگانے کے بعد ''الانسان'' ہوگا تو ''یاایھا الانسان'' کہیں گے۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶﴾ (الانفطار) لیکن ''اللہ'' کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں براہِ راست ''یائے ندا'' لگتی ہے: یااللہ۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ لفظ اللہ یہاں بطور اسمِ عَلم استعمال ہو رہا ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ان دونوں آراء کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس لفظ کی اصل تو یہی ہے کہ لفظِ الٰہ پر ''الف لام'' داخل کر کے اللہ بنا ہے لیکن اب یہ ہر اعتبار سے باری تعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور بطور عَلم ہی استعمال ہو رہا ہے۔ اس طور سے گویا وہ دونوں آراء جمع ہو گئیں۔ اب اگر پہلی رائے کو سامنے رکھیں تو پھر معنی اس کے سوا کچھ ہوں گے ہی نہیں' یعنی صرف وہ ذاتِ باری تعالیٰ۔ لاہور کے کیا معنی ہیں؟ اس سے مراد ایک شہر ہے جس کا نام لاہور ہے۔ لیکن اگر دوسری رائے ہے تو پھر تعین کرنا پڑے گا کہ اس کا مادہ کیا ہے' یہ کہاں سے نکلا ہے اور اسی سے پھر متعین ہوگا کہ اس کے معانی کیا ہیں!

لفظ ''اللہ'' کا مادہ اور حروفِ اصلی

اب یہ عجیب بات ہے کہ اس کے مادّہ اشتقاق کے بارے میں بھی متعدد آراء پائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ بھی ایک بڑا معجزہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ایک ذہنی ونفسیاتی رابطہ اور رشتہ قائم کرنے میں جتنی نسبتیں ہو سکتی ہیں وہ تمام نسبتیں اس مادہ کے

اصل لغوی مفہوم کے اندر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ تین آراء موجود ہیں: (۱) ''اِلٰہ'' سے مشتق ہے‘ اس کے حروف اصلیہ: ''ا،ل،ہ'' ہیں۔ (۲) ''ولہ'' سے بنا ہے اور اس کے حروفِ اصلیہ ''و،ل،ہ'' ہیں۔ (۳) ''لاہ'' سے بنا ہے اور ''ل،ی،ہ'' اس کے حروفِ اصلیہ ہیں۔ عربی زبان میں تعلیلات کا معاملہ بڑا مشکل ہوا کرتا ہے اور حروفِ علت (الف‘ واؤ‘ یا) میں آپس میں بڑا ردّوبدل ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا یہ تینوں آراء موجود ہیں‘ جن کا امام راغب اصفہانیؒ نے ذکر کیا ہے۔(۳)

اب ان تینوں مادوں کے بنیادی مفہوم ملاحظہ کریں۔ ا،ل،ہ کا مادہ دو معنی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے ''اَلَہَ الْفَصِیْلُ اِلٰی اُمِّہٖ''۔ اگر کسی اونٹنی کا دودھ پیتا بچہ ماں سے جدا کر لیا گیا ہو‘ آپ نے اسے کہیں دور باندھا ہوا ہو اور اُس کی رسّی کھل جائے یا وہ رسّی تڑا لے تو جس طرح وہ اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے اور خاص طور پر ماں کے بھی تھنوں کی طرف جاتا ہے‘ جانور کے بچے کی یہ کیفیت ''ا،ل،ہ'' کے مادہ کے اندر بنیادی مفہوم کے طور پر شامل ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ''اَلَہَ ای تحیَّر'' یعنی حیران ہو جانا‘ حیرت زدہ ہو جانا۔ انسان کسی شے کی کنہ تک نہ پہنچ پائے اور متحیّر ہو کر رہ جائے‘ حیران اور ششدر ہو کر رہ جائے۔ یہ بھی اس کے بنیادی مفہوم میں شامل ہے۔

''ولہ'' کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے آپ بڑی آسانی سے لفظ یاد رکھ سکتے ہیں: والہانہ عشق‘ جو ہم اردو میں بولتے ہیں۔ ''وَلَہ'' کا بنیادی مفہوم کسی کی ذات سے انتہائی محبت کی کیفیت ہے۔ والہانہ عشق ایک معروف اور جانی پہچانی کیفیت ہے‘ جس کو ہم ان الفاظ کے حوالے سے جانتے ہیں۔ ''لاہ'' کا بنیادی مفہوم ہے: ''لاہ ای احتجب'' یعنی کسی چیز کا مخفی ہو جانا‘ چھپ جانا‘ اوٹ میں ہو جانا‘ پردے میں ہو جانا۔

اللہ سے تعلق کی مختلف سطحیں

اب ان چاروں کیفیات کو جمع کریں گے تو اس میں تین نسبتیں نکلتی ہیں: (۱) کسی ہستی کی طرف اپنی احتیاجات کے لیے رجوع کرنا۔ بے ساختہ‘ بے اختیار کسی کی طرف

(۳) مفردات القرآن للراغب: ج۱‘ ص ۵۹۔

لپکنا‘ جیسے ماں سے بچھڑا ہوا بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے۔ (۲) کسی ہستی کی انتہائی محبت دل میں پیدا ہو جانا‘ اور (۳) کسی ہستی کے بارے میں متحیّر ہو کر رہ جانا۔ یہ تینوں بنیادی کیفیات سامنے رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی تینوں نسبتیں ذہنی اور نفسیاتی طور پر ممکن ہیں۔ وہ ہستی کہ جسے ہم خالقِ کائنات‘ مالکِ کائنات اور ربّ السماوات والارض کے حوالوں سے جانتے ہیں‘ اس کے بارے میں اگر تجزیہ کیا جائے تو اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے تین قسم کے انسان آپ کو ملیں گے اور وہ اپنے شعور کی سطح کی نسبت سے اس ہستی کے ساتھ ایک ذہنی یا نفسیاتی رشتہ یا کیفیت کے حامل ہوں گے۔ ایک بالکل عوامی سطح ہے۔ اس سطح پر انسان اپنی ذاتی احتیاجات‘ اپنی تکالیف‘ اپنی مصیبتوں اور اپنی مشکلات ہی میں ڈوبا ہوا رہتا ہے۔ وہ اسی میں مصروف ہے۔ روزی کمانے کے لیے جدّوجُہد کرنا ہے‘ کہیں حوادثِ زمانہ ہیں‘ کہیں مصائب ہیں‘ کہیں تکالیف ہیں‘ کوئی بیماری آ گئی ہے‘ کوئی مشکلات آن پڑی ہیں‘ کوئی کسی مقدمہ میں پھنس گیا ہے۔ عام انسان اس سطح سے بلند نہیں ہو پاتا۔ اس سطح پر اللہ کا یہی تصوّر اس کے سامنے رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس کی یہ نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر قائم ہو جائے تو یہ اس کے لیے کفایت کر جائے گی کہ اللہ ہی رازق ہے‘ وہی روزی رساں ہے‘ وہی حاجات کا پورا کرنے والا ہے‘ وہی تکالیف کو دور کرنے والا ہے‘ وہی پریشانیوں سے نجات دلانے والا ہے:

﴿وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿٧٩﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ﴿٨٠﴾﴾ (الشعراء)

''اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے۔''

اسی نسبت کو ذرا ایک دوسرے اعتبار سے کہیے کہ اُس کے سوا کوئی روزی رساں نہیں ہے‘ اُس کے سوا کوئی حاجت روا نہیں ہے‘ اُس کے سوا کوئی مشکل کشا‘ کوئی تکلیف دور کرنے والا نہیں ہے‘ اُس کے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے‘ اپنے ہاں کی بڑی بوڑھی خواتین جب بچوں کو دوا پلا رہی ہوں تو ساتھ ہی ساتھ کہہ رہی ہوتی ہیں کہ اللہ شافی‘ اللہ کافی۔ یعنی شفا دوا میں نہیں ہے‘ شفا اللہ دے گا۔ ایک ذریعہ کے طور پر ہم اس دوا کو اختیار کر رہے ہیں‘ لیکن شفا اس دوا میں نہیں ہے۔ لَا شَافِیَ اِلَّا هُوَ، وَلَا

رَازِقَ اِلَّا ھُو ۔ اگر کسی کو یہ درجہ حاصل ہو گیا ہے تو یہ اسے کفایت کرتا ہے‘ اس کی توحید مکمل ہو گئی۔ یہ تو ہے وہ کیفیت جیسے کہ ایک بچہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے ماں کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے اندر اپنی احتیاجات کا بس اتنا ہی شعور ہے۔

اس سے ذرا بلند تر سطحیں دو ہیں۔ ایک بلند تر سطح فلاسفہ‘ اہلِ منطق اور علماء کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس پہلے والی سطح سے بلند تر ہیں۔ وہ غور کرتے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے! ان کے ہاں ممکن الوجود اور واجب الوجود کی تقسیم ہے۔ واجب الوجود کی صفات پر بحث ہے۔ پھر یہ کہ ان دونوں یعنی خالق اور مخلوق کے مابین کیا تعلق ہے؟ یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن کی آخری حد تک پہنچتے پہنچتے انسان متحیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بیچارے حقیقت کو پانے سے محروم رہ جاتے ہیں وہ لاادریت (Agnosticism) اور ارتیابیت (Scepticism) کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں‘ یعنی بے یقینی اور شک وشبہ کی کیفیت کہ کچھ پتا نہیں۔ ع ’’کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا!‘‘ یہ معاملہ سمجھ میں نہیں آ سکتا‘ اس کی تہ کو کوئی نہیں جان سکتا‘ اصل حقیقت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ یہ ’’لاادریت‘‘ ہے اور اس سے بھی ایک کم تر سطح ’’ارتیابیت‘‘ کی ہے‘ پتا نہیں کچھ ہے بھی یا نہیں! کہیں یہ سارا سراب ہی نہ ہو۔ ع ’’رہا یہ وہم کہ ہم ہیں تو یہ بھی کیا معلوم!‘‘ البتہ جو اس سطح سے اوپر بھی پہنچیں گے وہ بھی اس حد تک ہی پہنچ پائیں گے کہ بس ایک ذات موجود ہے۔ ؎

دور بینانِ بارگاہِ الست غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست!

ان کے غور وفکر کے مطابق ہے تو سہی ایک ذات‘ لیکن وہ ذات کیسی ہے؟ یہ معلوم نہیں! یہ جان لیجیے کہ فلسفہ کی سطح پر صفات اور ذات کا جو باہمی ربط ہے وہی لاینحل ہے۔ ع ’’ہیں صفاتِ ذاتِ حق‘ حق سے جدا یا عینِ ذات!‘‘ یہ مسئلہ حل ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ فلاسفہ کے ہاں اس بات پر آ کر پھر اکتفا کرنا پڑا کہ ’’لاعین ولا غیر‘‘ یعنی صفات نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں۔ تو پھر کیا ہیں؟ یہ ہے تحیر یعنی حیران وششدر رہ جانا۔ یہ دوسری سطح ہے۔

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ وہ فلسفی بڑا محروم رہے گا کہ جو صوفی نہ بن جائے۔ خالص فلسفہ اول تو ’’ارتیابیت‘‘ پر روک دے گا‘ وہاں سے آگے بڑھے گا تو ’’لاادریت‘‘ پر پہنچ

جائے گا‘ مزید اوپر جائے گا تو تحیر کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ وہ ذات مخفی ہے (احتجب)۔ اگرچہ اس کے احتجاب کی شان امام فخر الدین الرازیؒ کے الفاظ میں یہ ہے: فسبحان من احتجب عن الظھور بشدۃ ظھورہ۔ یعنی پاک ہے وہ ذات جو چھپ گئی ہے‘ اپنے ظہور کی شدّت کے پردے میں۔ شدّتِ ظہور اس قدر ہے کہ وہ ایک پردہ بن گیا ہے اور وہ ذات اس پردے کے اندر چھپ گئی ہے۔ جیسے کہ بہت تیز روشنی ہو تو آپ کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور آپ کو اندھیرا محسوس ہوگا‘ آپ کچھ دیکھ نہیں سکیں گے۔ پس وہ مُحْتَجِب (پردے میں) تو ہے لیکن اپنے شدّتِ ظہور کی وجہ سے چھپ گیا ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید: ۳) الظاھر بھی وہی ہے اور الباطن بھی وہی ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ دوسری سطح۔

تیسری سطح بلند ترین ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے ربّ کی ایک والہانہ محبت پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا ایسا رشتہ پیدا ہو جائے جسے قرآن بایں الفاظ بیان کر رہا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ’’اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوئے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔‘‘ چنانچہ ’’الٰہ‘‘ وہ ہستی ہے کہ جو سب سے بڑھ کر محبوب ہو‘ جس کی محبت سب سے بڑھ کر قلب پر قبضہ کر لے‘ مستولی ہو جائے‘ چھا جائے۔ اب یہ تین سطحیں ہیں اور تین ہی نسبتیں ہو سکتی ہیں۔ لفظ ’’الٰہ‘‘ پر الف لام داخل کر کے ’’اللّٰہ‘‘ مانا جائے تو اس کے اندر یہ تینوں مفہوم شامل ہو جاتے ہیں۔

رحمٰن اور رحیم: مفہوم اور فرق

بقیہ دو اسماء ’’الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم‘‘ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ ’’رحمت‘‘ ہے‘ لیکن رحمت کی یہ دو مختلف شانیں ہیں جو دو مختلف الفاظ میں بیان ہو رہی ہیں۔ اس میں کچھ لوگوں کو دِقتیں بھی ہوئی ہیں جبکہ کچھ ذہین لوگوں نے انہیں اپنی ذہانت اور فطانت کی جولان گاہ بھی بنایا ہے‘ اور بڑے بڑے نکتے ان میں سے نکالے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ جان لیجیے کہ عربی زبان میں فَعلان کا وزن مبالغے کے

صیغے کے طور پر آتا ہے اور اس میں کسی کیفیت کی شدّت‘ جوش وخروش اور ایک ہیجانی و طوفانی کیفیت کا نقشہ سامنے آتا ہے (لفظ ہیجان بھی فعلان کے وزن پر ہے)۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی عرب کہے: انا عَطشان! تو اس کے معنی ہوں گے کہ ’’میں شدّتِ پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔‘‘ غَضبان (بہت شدید حالتِ غصہ میں) کا لفظ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے جو آپؑ پر طاری ہوئی تھی کہ جب آپؑ نے کوہِ طور سے واپس آ کر یہ دیکھا کہ قوم بچھڑے کی پرستش میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہاں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ (الاعراف:۱۵۰) یعنی انتہائی غضب ناک۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ویسے ہی بڑی جلالی طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کا مزاج جلالی اور پھر اس پر ’’غَضْبَان‘‘ کی کیفیت۔ اس وزن پر جب لفظ ’’رحمٰن‘‘ آیا تو اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کی ایک شان سامنے آ رہی ہے‘ جس کو ہم یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہو جس میں اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی ہوں‘ تموج (ہیجانی کیفیت) ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ شان لفظ ’’رحمٰن‘‘ میں پائی جاتی ہے۔

البتہ اس میں ایک نکتہ اور بھی ہے۔ عام طور پر اس کیفیت میں دوام نہیں ہوتا۔ اس قسم کی کیفیت تھوڑی دیر کے لیے آتی اور چلی جاتی ہے‘ لہٰذا اس میں کچھ عارضی ہونے کا معاملہ بھی پایا جاتا ہے‘ جو دوام اور استمرار کی ضد ہے۔ جوش آتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں رہتا‘ جلد ختم ہو جاتا ہے۔ غضبناکی کی کیفیت آتی ضرور ہے لیکن اس میں دوام نہیں ہوتا‘ جلد زائل بھی ہو جاتی ہے۔ جبکہ عربی زبان میں ’’فعیل‘‘ کا وزن کسی صفت کے دوام واستمرار اور پائیداری کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ جس صفت میں استقلال ہو وہ صفت مستقل طور پر اپنے موصوف میں موجود ہوتی ہے۔ اب دونوں الفاظ کو سامنے رکھ کر علماء اور محققین نے کچھ آراء دی ہیں۔ چنانچہ عام طور پر آپ کو ایک جملہ ملے گا: رحمٰنُ الدُّنیا وَ رَحِیمُ الآخِرۃ! اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی نسبت کی گئی دنیا کی طرف کیونکہ دنیا عارضی ہے اور صفت رحیمیت یا شانِ رحیمیت کو آخرت کی طرف منسوب کیا گیا کہ وہ دائم ہے‘ باقی رہنے والی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾﴾ (الاعلیٰ) یہ اس وجہ سے کہ فَعلان

کے اندر ایک عارضی پن کی کیفیت ہوتی ہے جبکہ فَعِیل میں دوام اور استمرار ہوتا ہے۔ تو یہ آپ کو عام طور پر مصحف‘ تراجم یا حواشی میں ملے گا: رحمٰن الدُّنیا ورَحِیمُ الآخرۃ۔

اس ضمن میں ایک نکتہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک حدیث کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ، اَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ، فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا، وَاَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً، يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۴)

’’اللہ تعالیٰ کے پاس رحمت کے سو حصے ہیں۔ اُس نے اس رحمت میں سے ایک حصہ جنّوں‘ انسانوں‘ جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں میں اتارا۔ اسی وجہ سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے نرمی اور رحم کا معاملہ کرتے ہیں اور اسی وجہ سے جانور اپنے بچے پر پیار رکھتا ہے۔ رحمت کے ننانوے حصے اللہ تعالیٰ نے بچا رکھے ہیں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے‘ ننانوے حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ کُل مخلوقات میں تقسیم کر دیا۔ تمام والدین خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں‘ جنّوں میں سے ہوں‘ حیوانات میں سے ہوں‘ یا دیگر مخلوقات میں سے ہوں‘ ان کے دلوں میں جو رحمت ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُس سوویں حصے کا ظہور ہے۔ اس رحمت کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک مثال سے بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی دانش مند کا ذہن جب اس طرف جائے گا تو وہ کوئی نکتہ نکال لے گا۔

والدین میں رحمت کی دو کیفیات ہوتی ہیں۔ والد کی رحمت اور شفقت کی شکل کچھ اور ہے جبکہ والدہ کی رحمت کی شکل کچھ اور۔ والد کی شفقت میں یہ چیز مدِّنظر ہوگی کہ اولاد ترقی کرے‘ اعلیٰ مراتب پر پہنچے‘ چاہے اسے مشقت جھیلنی پڑے‘ تکلیف اٹھانی پڑے۔ والد کے سامنے کچھ اور مقاصد ہوتے ہیں اور وہ ان اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کے لیے

(۴) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب جعل اللّٰہ الرحمۃ فی مأۃ جزء‘ ح ۵۶۵۴ وصحیح مسلم‘ کتاب التوبۃ‘ باب فی سعۃ رحمۃ اللّٰہ‘ ح۲۷۵۲ (واللفظ لہ)

اولاد کی تکلیف اور مشقت کو بھی جھیلنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ والدہ کی رحمت کا معاملہ بالکل اور ہوتا ہے کہ بچے کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو ذاتی عافیت و راحت ہے‘ والدہ کی رحمت اس درجے کے اندر رہے گی۔ علامہ موصوف کا کہنا ہے کہ تمام مخلوقات میں جو باپ کی رحمت وشفقت ہے اس کو جمع کر کے سو سے ضرب دیجیے تو وہ لفظ رحمان کا ظہور بن جائے گا‘ جبکہ والدہ کی شفقت اور رحمت کو تمام مخلوقات کی اس سطح پر جمع کر کے اس کو سو سے ضرب دیجیے تو یہ لفظ رحیم کا ظہور بن جائے گا۔

رحمان اور رحیم دونوں میں نسبت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک بہت ہی پیاری تمثیل اور تشبیہ ہے کہ آپ کہیں کسی سڑک سے گزر رہے ہوں اور وہاں پر اسی وقت کوئی حادثہ ہوا ہو اور بہت سے لوگ اس میں ہلاک ہو گئے ہوں۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص دیکھے کہ ایک ماں ہے جو اس حادثے میں ہلاک ہو گئی ہے اور اس کا دودھ پیتا بچہ اُس کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے‘ وہ بچ گیا ہے۔ اب ہر شخص اپنے دل کو ٹٹولے اور اس حالت کو اپنے اوپر طاری کر کے دیکھے کہ اس کی کیفیت کیا ہو گی۔ ایسے میں ہر شخص یہی چاہے گا کہ اس بچے کی پرورش میں اپنے ذمہ لے لوں۔ یہ بے کس ابھی عمر کی اس سطح پر ہے کہ اپنے وجود کو خود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اس کی کفالت کی ذمہ داری لے۔ کیسا ہی کٹھور دل انسان ہو‘ واقعہ یہ ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر وہ رہ نہیں سکتا اور اس بچے کی کفالت اور پرورش کا ذمہ لے لے گا۔ البتہ یہ جذباتی کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند دن کے بعد وہ جوش وخروش ختم ہو تو آدمی پچھتائے کہ یہ کیا بوجھ میں اپنے ذمہ لے بیٹھا ہوں۔ وہ تو ایک وقتی اور جذباتی کیفیت تھی جو آئی اور چلی گئی۔ میری ذمہ داریاں پہلے ہی بہت تھیں‘ وقتی طور پر میں نے جوش میں آ کر یہ ایک اضافی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ ہم میں سے اکثر کا حال یہی ہو گا کہ بعد میں شاید ہم پچھتائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں جوش والی کیفیت تو ہے‘ لیکن مستقل مزاجی والی نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اندر یہ دونوں شانیں موجود ہیں۔ ہیجان والی شان بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ استقلال و استمرار والی شان بھی ہے۔

ان دونوں صفات کا تقابل کرتے ہوئے جن حضرات کو عارضی پن کا احساس ہوا ہے وہ میری ناقص رائے میں مغالطہ ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تمام شانیں مستقل بالذات ہیں‘ پائیدار ہیں۔ رحمت خداوندی کی یہ دونوں شانیں بیک وقت موجود ہیں۔ اگر ہمارے اندر کسی شان کا کوئی ہلکا سا پرتو آ جائے تو ہمیں کچھ سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے‘ ورنہ ہم تو واقعتاً کسی شے کے دوام اور استمرار کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ ہمارے تخیل اور ہماری قوتِ واہمہ سے بھی بعید ہے‘ اس کے باوجود کچھ کیفیات وارد ہوتی ہیں جن کے حوالے سے ہم کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ ان صفات باری تعالیٰ کے بارے میں کچھ تمثیلیں مفید اور ممد ہیں‘ لیکن ہم بتمام وکمال ان پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اللہ کی رحمانیت (جوش والی رحمت) مستقل ہے اور اللہ کی رحیمیت (ہمیشہ رہنے والی رحمت) بھی مستقل ہے۔ یہ دونوں شانیں ہمیشہ ہیں‘ ہر وقت ہیں‘ بیک وقت موجود ہیں۔

اس میں ایک نکتہ اور بھی ہے کہ تخلیق کو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا اور ربوبیت کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحیمیت کا مظہر مانا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی رحمانیت کے جوش میں تخلیق فرمایا اور اس کی مستقل ربوبیت فرما رہا ہے۔ یہ ربوبیت یعنی اس کی پرورش‘ نگہداشت اور تربیت اُس کی صفت رحیمیت کا ثمرہ ہے۔ بہرحال ان دونوں ناموں کو سامنے رکھیے اور اس پر اضافہ کیجیے اللہ کے نام نامی اسم گرامی اللہ کا‘ جسے اسم ذات مانا گیا ہے۔

اللہ کا تعارف: اشکال اور جواب

آخری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید ذاتِ باری تعالیٰ کی ہستی کا تعارف کن الفاظ میں کرا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت ردّ اور جواب ہے اس اعتراض کا جو عیسائیوں کی طرف سے نہ صرف قرآن پر بلکہ اسلام پر کیا جاتا ہے کہ قرآن اللہ کا تعارف زیادہ تر ایک ایسی ہستی کے طور پر کراتا ہے جس سے ڈرا جائے‘ جس سے خوف کھایا جائے۔ اسلام میں تقویٰ پر زور ہے‘ خوف کو ایک بنیادی محرک کی حیثیت سے ایکسپلائٹ کیا گیا ہے کہ ڈرو اللہ سے‘ ڈرو جہنم سے‘ ڈرو آخرت کے حساب سے! اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر بحیثیت

مجموعی قرآن کو پڑھیں تو یہ رنگ واقعتاً غالب نظر آتا ہے۔ عیسائیوں کا یہ کہنا ہے کہ ہم جس خدا کو مانتے ہیں‘ انجیل جس خدا کا تعارف پیش کرتی ہے‘ وہ خدا ایک محبوب ہستی‘ ایک شفیق ہستی‘ ایک ودود ہستی اور ایک رحیم ہستی ہے۔ اُس ذات سے محبت پیدا ہوتی ہے جبکہ قرآن کے پیش کردہ خدا سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب درحقیقت اسی میں مضمر ہے کہ آیت بسم اللہ جو ہر سورت کے آغاز میں درج ہے‘ مزید برآں سورۃ الفاتحہ کی پہلی دو آیات میں پھر انہی تین ناموں (اللہ + الرَّحْمٰن + الرَّحِیْم) کا حوالہ ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾ (الفاتحۃ)

’’کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار (اور مالک) ہے۔
بہت رحم فرمانے والا‘ نہایت مہربان ہے۔‘‘

تو بنیادی طور پر قرآن مجید اُس ہستی کا جو اس کائنات کی خالق و مالک ہے‘ یہ تعارف کراتا ہے۔ بنیادی تصور تو یہی ہے۔ اس والہانہ عشق کا تصور کیجیے جو لفظ اللہ میں چھپا ہوا ہے اگر اس کو وَلَہ سے مشتق مانا جائے۔ پھر رحمان‘ پھر رحیم۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفات ہیں جن کو قرآن مجید نمایاں کرتا ہے۔ البتہ بگڑے ہوئے ماحول میں اِنذار ضروری ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اور ع ’’نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!‘‘ جب منہ کا ذائقہ بگڑ چکا ہو تو کڑوی کسیلی دوائیاں دینی پڑتی ہیں۔ مرض کے ازالے کے لیے صالح اور مرغن غذا نہیں دی جاتی‘ بلکہ ہوسکتا ہے دوا کے بڑے کڑوے اور کسیلے پیالے بھر بھر کے پلانے پڑیں۔ قرآن مجید رسولوں کی دعوت کا اور رسولوں کے حالات کا بار بار تذکرہ کرتا ہے‘ اور رسول اسی وقت آتے رہے جب کہ قوموں کا مزاج بگڑ چکا ہوتا تھا‘ اصلاح کی ضرورت ہوتی تھی‘ آخری حجت قائم کرنا مقصود ہوتا تھا‘ لہٰذا اس وقت صورت یہی تھی۔ جس ندا سے دعوت کا آغاز ہوتا ہے اس کی کیفیت وہی ہے جس کو حالی نے اس شعر میں بیان کیا کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اس دعوت کے ذریعے ہلانا اور چونکانا مقصود ہوتا ہے۔ سوتے ہوؤں کو جگانا‘ نیند کے ماتوں کو ہوشیار کرنا‘ جو ہلاکت اور بربادی کی طرف جا رہے ہیں انہیں خبردار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں اِنذار کا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ’’اِنذار‘‘ کا ترجمہ عام طور پر ڈرانا کر دیا جاتا ہے جو درحقیقت صحیح نہیں ہے۔ انذار کا صحیح ترجمہ ہے: خبردار کرنا (to warn)۔ وارننگ بالکل مختلف چیز ہے‘ جبکہ تخویف اور چیز ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ﴾ (آل عمران: ۱۷۵)

’’(اے مسلمانو!) یہ شیطان ہے جو تمہیں ڈراتا ہے اپنے ساتھیوں سے۔‘‘

قرآن مجید میں اس خوف کو عام طور پر شیطان کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ بندۂ مومن‘ اللہ کے دوست کے لیے تو قرآن مجید کہتا ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (یونس)

’’آگاہ ہو جاؤ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

خوف اور شے ہے‘ تقویٰ اور شے ہے‘ اِنذار اور شے ہے۔ ہمارے ہاں اردو تراجم میں بالعموم تقویٰ کا ترجمہ بھی ڈر‘ انذار کا بھی ڈر اور خوف کا بھی ڈر کیا گیا ہے۔ ایسے ترجموں سے پھر مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ انذار کا معنی ہے خبردار کرنا‘ warn کرنا‘ caution دینا کہ جس راستے پر جا رہے ہو وہ ہلاکت و بربادی کا راستہ ہے۔ تقویٰ کا معنی ہے بچنا اور اس سے مراد ایسی چیز سے بچنا بھی ہے جو فی الاصل خوفناک ہو اور یہ بچنا ایسا بھی ہے کہ اس بات سے بچو کہ کہیں تمہارے والد ناراض نہ ہو جائیں۔ اب یہ کچھ اور طرح کا خوف ہے۔ والد کا خوف کچھ اور ہے جبکہ کسی درندے کا خوف اس سے مختلف ہے۔ والد کے خوف کے اندر ایک محبت اور شفقت لپٹی ہوئی ہوتی ہے‘ جبکہ دوسرا مجرد خوف ہے‘ جیسے ایک ڈراؤنی چیز کا خوف‘ ایک مضر شے کا خوف۔ لہٰذا ان دونوں میں بآسانی فرق کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید لفظ ’’تقویٰ‘‘ استعمال کرتا ہے تو اس کے مفہوم کو جب سیاق و

سباق کی روشنی میں سمجھ کر پڑھا جائے گا تو وہ اشکال نہیں ہوگا۔ اسی طرح قرآن مجید میں لفظ ''انذار'' آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کو سمجھیں گے تو وہ اشکال نہیں ہوگا۔ باقی اصل جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ایک مثبت تعارف قرآن مجید جس طرح سے کرا رہا ہے وہ آیت بسم اللہ سے سمجھ میں آ گیا: بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ''اُس اللہ کے نام سے جو رحمان ہے اور جو رحیم ہے۔'' اس کی رحمتیں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند بھی ہیں اور بیک وقت ان میں دوام بھی ہے' استمرار بھی ہے' پائیداری بھی ہے۔

بسم اللہ: ہماری تہذیب وتمدن کا ایک جزو!

''بسم اللہ'' ہمارے تمدن اور تہذیب کا ایک جزو بن گیا ہے۔ کوئی کام کرو بسم اللہ! اللہ کے نام کے ساتھ۔ یہ ہمارا کلچر ہے' ہماری تہذیب ہے' ہمارا تمدن ہے۔ اس میں فوراً انسان متوجہ ہوتا ہے کہ میں جو کام کر رہا ہوں وہ اللہ کی مرضی کے مطابق بھی ہے یا نہیں! اس میں پھر وہ سہارا لیتا ہے کہ میری کامیابی کا دارومدار اللہ کی مدد اور توفیق پر ہے۔ سب سے بڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت کے وقت جب ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھیں گے تو اس میں ایک امتثالِ امر (حکم کی تابع داری) ہو جائے کہ وہ پہلی آیت جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی: ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾ (العلق) ''پڑھو اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا فرمایا۔'' گویا کہ آج آیت بسم اللہ کا درس اس پہلی آیت پر امتثالِ امر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم قرآن مجید کے مطالعہ کا آغاز کر رہے ہیں اور ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾ کے مطابق ہم نے آج آیت ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فہم عطا فرمائے اور جس کام کا آج ہم نے بیڑا اٹھایا ہے اللہ کی تائید اور توفیق کے بھروسے پر اور اُسی کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ' اب یہ اسی کے حوالے ہے کہ یہ کام تسلسل اور پابندی کے ساتھ ہوتا رہے' اس میں کوئی رخنے نہ آئیں اور اس طرح قرآن مجید کا درس مکمل ہو جائے۔ منزل بڑی لمبی ہے' سفر بہت طویل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کام بہت کٹھن بھی ہے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز!

(ترتیب وتدوین: ابوعبدالرحمٰن شبیر احمد نورانی' حافظ خالد محمود خضر) ❁❁

دروسِ قرآن کی تاریخ

بانی تنظیم اسلامی' صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں جب مَیں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو علامہ اقبال کی مشہور نظم ''جواب شکوہ'' کا یہ شعر دل میں پیوست ہو گیا کہ: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے کراچی اور ساہیوال کے گرد ونواح میں درسِ قرآن شروع کیا تاوقتیکہ ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہوئے۔ ۱۹۶۶ء سے لاہور میں حلقہ ہائے دروسِ قرآن قائم کیے اور مختلف جگہوں پر دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں مسجد خضراء' سمن آباد سے سلسلہ وار درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ پھر ۱۹۷۴ء میں مسجد شہداء' مال روڈ پر موقع ملا تو اس درسِ قرآن کو دوبارہ سے شروع کیا۔ وہ درسِ قرآن جو ۱۹۷۴ء سے سلسلہ وار شروع ہوا' ۱۹۹۱ء میں اسی قرآن آڈیٹوریم میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۱۹۹۱ء ہی میں یہیں پر درسِ قرآن کا دوبارہ آغاز کیا جو کہ فروری ۱۹۹۲ء میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ پر جا کر رُک گیا۔ پھر ڈھائی سال کا وقفہ رہا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحبؒ نے اسی آڈیٹوریم میں تفصیلی منتخب نصاب کے دروس ریکارڈ کرائے جو تقریباً ۱۵۰ گھنٹوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں یہ سلسلۂ درس وہیں سے دوبارہ شروع ہوا جہاں سے چھوڑا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ سے ۱۶۷ تک سلسلہ جاری رہا' جس کے بعد سوا پانچ سال کا فصل آیا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحبؒ کا گھٹنوں کا آپریشن بھی ہوا اور بہت سارے غیر ملکی دورے بھی رہے۔ پھر اسی آڈیٹوریم میں ۱۹ اپریل ۲۰۰۰ء کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۸ سے دوبارہ سلسلہ شروع ہوا جو فروری ۲۰۰۶ء تک جاری رہا۔ اس میں سورۃ المائدۃ کی تفسیر تک ڈاکٹر صاحبؒ نے ریکارڈنگ کروائی۔ ۵ مارچ ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ نے درسِ قرآن کی یہ ذمہ داری محترم ڈاکٹر عارف رشید کے حوالے کی۔ محترم ڈاکٹر عارف رشید نے ۱۲ مارچ ۲۰۰۶ء کو یہ ذمہ داری ادا کرنا شروع کی اور ۱۴ جولائی ۲۰۲۴ء کو اسی جگہ درسِ قرآن کی تکمیل ہوئی۔ یہ مختصر تاریخ تھی درسِ قرآن کی جو ڈاکٹر صاحب نے شروع کیا! ❁

تعلّم و تعلیمِ قرآن: کیوں اور کیسے؟

پروفیسر ڈاکٹر نجیب الحق ☆

رمضان کی عظمت قرآن کی وجہ سے ہے۔ اس میں قرآن نازل ہوا اور اسی میں لیلۃ القدر بھی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ قرآن اور رمضان کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ رمضان کا مقصد تقویٰ کا حصول ہے اور قرآن متقین کے لیے ہدایت ہے۔ تقویٰ کا حصول قرآن کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ رمضان کے مہینے میں قرآن کو اپنی تمام مصروفیات کا محور بنا لینا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (متفق علیہ)

''جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اور جو رمضان کی راتوں میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کے ساتھ اس کے بھی پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

دنیا میں ہر مشین کا مقصد اس کے بنانے والے نے ''ہدایتِ عملیہ'' (Operation Manual) میں بیان کیا ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان دنیا میں ہمارا مقصد اور زندگی گزارنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب جاننے کے لیے ہمیں اپنے بنانے والے (خالق) ہی کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا، جس نے قرآن ''ہدایتِ عملیہ'' کی صورت میں ہمیں عطا فرمایا اور سنّتِ رسول اللہ ﷺ اس کی عملی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ نہ صرف انسانوں کی ضرورت بلکہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم بھی ہے کہ مقصدِ حیات اور طریقہ زندگی معلوم کرنے کے لیے ہمیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا۔

☆ پروفیسر، پشاور میڈیکل کالج، پشاور professornajib@yahoo.com

بدقسمتی سے آج عملی زندگی میں قرآن ہمارا راہنما نہیں ہے۔ ہم نے نظامِ زندگی کے لیے قرآن کی بجائے عملاً دوسروں کو رہنما بنا لیا ہے۔ ؎

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دیے سائے ہم نے!

ہمیں قرآن کی اہمیت اور افادیت کا صحیح ادراک ہی نہیں ہے، اس لیے اوروں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ قرآن سے دوری ہی مسلمانوں کے زوال کا ایک بنیادی اور اہم ترین سبب ہے۔ حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

''میرے پاس جبریلؑ آئے اور کہنے لگے کہ: اے محمد ﷺ! آپ کی اُمت آپ کے بعد اختلافات میں پڑ جائے گی۔ میں نے پوچھا کہ: اے جبریل! اس سے بچاؤ کا راستہ کیا ہے؟'' انہوں نے کہا: قرآن کریم، اسی کے ذریعے اللہ ہر ظالم کو تہس نہس کرے گا۔ جو اس سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ جائے گا وہ نجات پا جائے گا اور جو اسے چھوڑ دے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ یہ بات انہوں نے دو مرتبہ کہی۔'' (مسند احمد)

ہماری موجودہ حالت

آج اُمت کا عمومی رویہ، معاذ اللہ، ایسا لگتا ہے جیسے یہودیوں کا تورات کے بارے میں تھا:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۵﴾ (الجمعۃ)

''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا مگر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ بہت بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

کیا قرآن سیکھنا فرض ہے؟

قرآن پڑھنے/سیکھنے سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرتا، لیکن وہ اسے محض ثواب کا کام سمجھتا ہے۔ یہ احساس کم ہی ہے کہ قرآن سیکھنا کتنا اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ﴾ (القصص: ۸۵)

''(اے نبی ﷺ!) یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک

بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے۔‘‘

یعنی اس قرآن کو خلق خدا تک پہنچانے‘ اس کی تعلیم دینے اور اس کی ہدایت کے مطابق دنیا کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری آپؐ پر ڈالی گئی ہے:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۵۵﴾ (الانعام)

’’اور یہ برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے‘ پس اس کی پیروی کرو اور (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴۳ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔـلُوْنَ ۝۴۴﴾

’’(اے پیغمبر ﷺ!) تم اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے‘ یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے‘ اور عنقریب تم لوگوں سے اس کی بابت باز پرس ہوگی۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس کا اتباع کرنے اور اس کی جواب دہی کا مسئول بنایا۔ انسان مسئول تب ہی ہوسکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ اس کتاب میں میرے لیے کیا احکام ہیں جن کا میں نے حساب دینا ہے! پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ وغیرہ فرض کیے ہیں جن کی ادائیگی اس وقت تک صحیح طور پر نہیں ہوسکتی جب تک ان کے بارے میں بنیادی تفصیلات معلوم نہ ہوں‘ اسی طرح زندگی گزارنے کے لیے قرآن کے بنیادی احکام کو سیکھنا‘ ماننا اور ان پر عمل کرنا بھی فرائض میں سے ہے۔ یہی قرآن کی فرضیت ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے پانچ حقوق بیان کیے ہیں:

(۱) قرآن پر ایمان لانا

(۲) اس کی تلاوت کرنا

(۳) اس کے معانی کو سمجھنا اور اس میں غور و فکر کرنا

(۴) اس پر عمل کرنا

(۵) اسے دوسروں تک پہنچانا۔

قرآن کے انہی حقوق کے بارے میں ہم سے سوال ہوگا!

قرآن نہ سمجھنے/ چھوڑنے والوں کا انجام

i) روزِ محشر اندھا اُٹھایا جانا

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝۱۲۴ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝۱۲۵ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝۱۲۶﴾ (طٰہٰ)

’’اور جو میرے ذکر (قرآن) سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار! دنیا میں تو مَیں آنکھوں والا تھا‘ یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں اسی طرح تو ہماری آیات کو‘ جب کہ وہ تیرے پاس آئی تھیں‘ تُو نے بھلا دیا تھا۔ اسی طرح آج تُو بھلایا جا رہا ہے۔‘‘

ii) قرآن چھوڑنے والوں کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی گواہی:

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾

’’اور رسولؐ کہے گا: اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز بنا دیا تھا۔‘‘

اس آیت کی تشریح میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ بیان کرتے ہیں:

’’تاویلِ خاص کے مطابق حضور ﷺ کی یہ شکایت قریشِ مکّہ کے بارے میں ہے کہ اے میرے پروردگار! میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچانے اور انہیں قرآن سنانے کی ہر امکانی کوشش کی ہے‘ لیکن یہ لوگ کسی طرح اسے سننے اور سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں‘ جبکہ اس آیت کی تاویلِ عام یہ ہے کہ حضور ﷺ کی یہ شکایت قیامت کے دن اپنی اُمّت کے اُن افراد کے خلاف ہوگی جو اس ’’مہجوری‘‘ کے مصداق ہیں‘ کہ ان لوگوں نے قرآن کو لائقِ التفات ہی نہ سمجھا۔ علامہ اقبال کے اس مصرعے میں اسی آیت کی تلمیح پائی جاتی ہے: ع ’’خوار از مہجوریٔ قرآں شدی‘‘ کہ اے مسلمان آج تُو اگر ذلیل و خوار ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ تُو نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بہت اہم اور قابلِ غور نکتہ یہ بھی ہے کہ قریشِ مکّہ نے تو اپنی خاص ضد اور ڈھٹائی میں قرآن کو اس موقف کے تحت ترک کیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے ہی

نہیں اور محمد (ﷺ) نے خود اپنی طرف سے اسے گھڑ لیا ہے۔ لیکن آج اگر کوئی شخص کہے کہ میں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اور اسے اللہ کا کلام مانتا ہوں‘ مگر عملی طور پر اس کا رویہ ایسا ہو کہ وہ قرآن کو لائقِ اعتناء نہ سمجھے‘ نہ اسے پڑھنا سیکھے‘ نہ کبھی اس کے پیغام کو جاننے کی کوشش کرے تو گویا اس کے حال یا عمل نے اس کے ایمان کے دعوے کی تکذیب کر دی۔ چنانچہ اس آیت کے حاشیے (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ’’آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے‘ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا‘ اس میں تدبّر نہ کرنا‘ اُس پر عمل نہ کرنا‘ اُس کی تلاوت نہ کرنا‘ اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجّہ نہ کرنا‘ اُس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجّہ ہونا‘ یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔‘‘

تفسیر ابن عباسؓ میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اس روز رسول اکرم ﷺ فرمائیں گے: اے میرے پروردگار! اس قوم نے اس قرآن کریم کو‘ جو واجب العمل اور واجب الاعتقاد تھا‘ بالکل نظر انداز کر رکھا تھا کہ اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتے تھے‘ اس پر عمل تو درکنار۔

ابن کثیرؒ نے تشریح میں لکھا ہے کہ روزِ محشر نبی کریم ﷺ خود اپنی اُمّت کی شکایت جنابِ باری تعالیٰ میں کریں گے کہ ان لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ قرآن کو سننے سے گریز‘ اس میں شور ڈالنا اور اس پر ایمان نہ لانا اسے چھوڑنا ہے۔ اسی طرح بقدرِ ضرورت اس کا علم حاصل نہ کرنا‘ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہ کرنا‘ اس کے اوامر پر عمل نہ کرنا اور اس کی منع کردہ چیزوں سے باز نہ آنا بھی اسے چھوڑنا ہے۔ اسے چھوڑ کر دوسری چیزوں کو اختیار کرنا‘ اور لوگوں کے اقوال و آراء اور ان کے بنائے ہوئے طریقوں کو قرآن پر ترجیح دینا بھی اسے چھوڑنا ہے۔

یہ آیت ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے‘ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ خود کسی کے خلاف گواہی دیں تو ایسا بدقسمت شخص اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے کیسے بچ سکتا ہے؟

iii) اللہ کا انتقام: اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی گناہ کے ارتکاب کے بارے میں خود انتقام لینے کا ذکر کم ہی کیا ہے‘ لیکن قرآن کو پس پشت ڈالنے پر فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ﴾ (السجدۃ)

’’اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اُس کے ربّ کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے! ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے۔‘‘

iv) دنیا میں شیطان سے گہری دوستی

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف)

’’جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے‘ ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں‘ اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔‘‘

قرین ایسے ساتھی کو کہتے ہیں جو ہر وقت ساتھ لگا رہے۔ ہمیں پوری سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ کیا ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ قیامت کے دن:

- ہم اندھے اٹھائے جائیں اور اللہ کو ہماری کوئی پروا نہ ہو؟
- رسول اللہ ﷺ ہمارے خلاف اللہ کے دربار میں گواہی دیں؟
- اللہ ربّ العزت ہم سے انتقام لے؟

جبکہ دنیا میں:

- ہر وقت شیطان ہمارا قریبی اور گہرا ساتھی بنا رہے؟

ان سوالوں کے جواب ہر مسلمان یقیناً نفی ہی میں دے گا۔ پس ہمیں آج ہی سنجیدگی سے قرآن کو سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کیا ان تمام کھلی تنبیہات کے باوجود کوئی یہ حسنِ ظن رکھ سکتا ہے کہ وہ قرآن سمجھے اور اس پر عمل کیے بغیر بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رحم کا مستحق ہو سکے گا؟

کیا قرآن سیکھنا مشکل ہے؟

بدقسمتی سے یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ قرآن ایک مشکل کتاب ہے اور اس کو سیکھنے کے لیے بہت سے علوم درکار ہیں۔ اس کا سیکھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور یہ صرف علماء کا کام ہے‘ جب کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر)

’’اور یقیناً ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنا دیا ہے‘ پھر کیا ہے کوئی نصیحت

قبول کرنے والا؟‘‘

مفتی محمد شفیعؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’قرآن کریم نے اپنے مضامینِ عبرت ونصیحت کو ایسا آسان کر کے بیان کیا ہے کہ جس طرح ایک عالم و ماہر، فلسفی اور حکیم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح عام لوگ جن کو علوم سے کوئی مناسبت نہ ہو وہ بھی عبرت ونصیحت کے مضامین کو سمجھ کر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔‘‘ (معارف القرآن)

علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کو معنی اور مضامینِ عبرت ونصیحت کے اعتبار سے عام لوگوں کے لیے بھی سمجھنا آسان ہے، البتہ مسائل اور احکام کا استنباط واجتہاد صرف علماء کرام ہی کا کام ہے۔

متذکرہ بالا آیت سورۃ القمر میں چار مرتبہ دہرائی گئی ہے، اور ہر بار اس سے پہلے فرمایا گیا ہے:

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝﴾

’’دیکھ لو، کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات!‘‘

اس میں یہ اشارہ ہے کہ اس آسان کتاب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرو گے تو پھر میرے عذاب کے لیے تیار رہو۔

قرآن سیکھنے کے درجے (Levels)

یہ بات پیش نظر رہے کہ عام آدمی کی حیثیت ایک طالب علم کی ہے اور اس کے لیے تذکر کی حد تک قرآن سیکھنا فرض ہے تاکہ وہ عمومی اوامر (احکامات) ونواہی (ممنوعات) کو جان لے۔ البتہ عصری دینی مسائل کے استنباط یا اجتہاد کے لیے قرآن پر تدبر صرف علماء کرام وفقہائے عظام کا کام ہے۔ ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق اس کی تشریح وتفسیر روزِ قیامت تک ہوتی رہے گی اور اس کے مطالب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

قرآن سیکھنے کا مقصد

قرآن سیکھتے وقت یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہم اسے کیوں سیکھ رہے ہیں! اصل مقصد زندگی کے ہر موڑ پر قرآن سے عملی راہنمائی حاصل کرنا ہے تاکہ ہم صراطِ مستقیم پر قائم رہیں۔ قرآن کے

اسرار ورموز پر تدبر، اس کے علمی اعجاز، علم میں اضافہ کرنا یا اس کی آیات کی تکوینی تشریحات سے لطف اندوز ہونا اس کے ضمنی فوائد ہیں۔

قرآن نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی کیونکہ ان کا قرآن سیکھنا ’’علم برائے عمل‘‘ کے لیے تھا۔ ابوعبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مروی مسند احمد کی ایک حدیث میں بیان ہوا ہے:

’’صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دس دس آیات پڑھتے تھے اور اگلی دس آیات اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے جب تک کہ پہلی دس آیات میں علم وعمل سے متعلق چیزیں اچھی طرح سیکھ نہ لیتے۔ یوں ہم نے علم وعمل کو حاصل کیا ہے۔‘‘

صحابہ کرامؓ قرآن کو عمل کے لیے پڑھتے تھے۔ مثلاً جب آیت:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۹۲﴾ (آل عمران)

’’تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے۔‘‘

نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بیرحاء کا محبوب ترین باغ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خیبر کی بہترین زمین اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اپنا محبوب ترین گھوڑا اللہ کی راہ میں دے دیا۔ اسی طرح جب شراب کی حرمت کا حکم آیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰﴾ (المائدہ)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔‘‘

تو لوگوں نے منہ سے لگے شراب کے پیالے ہٹا دیے۔ شراب کے پیالے اور مٹکے توڑ دیے۔ مدینہ میں اُس روز اتنی شراب بہائی گئی کہ ایک عرصے تک جب بارش ہوتی تو شراب کی بو اور رنگ مٹی میں نکھر آتا تھا۔

قرآن سے ہماری زندگی اسی لیے تبدیل نہیں ہو رہی کہ ہمارا مقصد یہ نہیں رہا۔ قرآن کو ’’علم برائے عمل‘‘ کے مقصد سے پڑھنے/سیکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہر ہر آیت میں اپنی زندگی کے لیے عملی نکات تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ان کو ترجیحاً اپنی انفرادی زندگی میں نافذ کریں

اور ساتھ ہی اجتماعی زندگی میں اس کے نفاذ کی جدّوجُہد کا حصہ بنیں۔ قرآن کریم کو اس طرح سیکھنے کے لیے چند اہم باتوں کی طرف توجہ ضروری ہے؛

(ا) قرآن کے بارے میں رویّہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝۸۱﴾ (الواقعة)

''یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو!''

اصل الفاظ ہیں ''اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ''۔ اِدْهَان کے معنی ہیں کسی چیز سے مداہنت برتنا' اس کو اہمیت نہ دینا' اس کو سنجیدہ توجہ کے قابل نہ سمجھنا۔ انگریزی میں to take lightly کے الفاظ اس مفہوم سے قریب تر ہیں۔ ہم قرآن کو پڑھتے وقت یہ بات نہ بھولیں کہ اس کا اصل مقصد صرف علم حاصل کرنا نہیں بلکہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔

(ب) شیطان کے حربے

ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہر کام کی ابتدا بسم اللہ سے کی جائے لیکن قرآن پڑھنے کی ابتدا اَعُوذُ بِاللّٰہِ سے کرنے کا حکم دیا گیا:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝۹۸﴾ (النحل)

''پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

شیطان کسی دوسرے عمل کے مقابلے میں قرآن فہمی میں سب سے زیادہ روڑے اٹکاتا ہے اور اس سے روکنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے:

(i) دنیاوی کاموں کو فوری اور ضروری جتلانا: شیطان دنیاوی کام مثلاً کسی سے ملاقات' ٹیلیفون کرنا' ٹی وی پروگرام دیکھنا' موبائل فون کے میسج چیک کرنا وغیرہ کو انتہائی ضروری بنا کر پیش کرتا ہے اور اکساتا ہے کہ پہلے یہ کام کرلو' اس کے بعد قرآن بھی پڑھ لو گے۔ اگر ہم غور کریں تو ان سب کو مؤخر کیا جاسکتا ہے اور کوئی کام اتنا اہم نہیں ہوتا کہ ہم اسے قرآن سیکھنے پر ترجیح دے دیں۔

(ii) دنیاوی کام کو دینی کام کے طور پہ دکھا کر دھوکا دینا: بسا اوقات جب ہم قرآن پڑھنے/سیکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو شیطان ایسے موقع پر نیکی کے دوسرے کاموں کو اہم تر اور دین

کے کام کے طور پیش کرتا ہے' مثلاً خدمتِ خلق کے کام' تعلقات نبھانا' سیاسی جِدّوجُہد میں حصہ لینا وغیرہ۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن وسُنّت کی بنیاد کے بغیر یہ سب کام بیکار اور خسارے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝۱۰۳ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝۱۰۴﴾ (الکہف)

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہو: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جُہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔''

(iii) دین ہی کے دوسرے کام سامنے لے آنا: شیطان کا ایک اور حربہ یہ ہے کہ دین کے دوسرے کام (خصوصاً عبادات) کو اتنا خوش نما اور اہم بنا دیتا ہے کہ ہم ان میں لگ کر قرآن سیکھنے کو اپنی ترجیحات میں نچلے درجے پر لے جاتے ہیں' مثلاً نوافل پڑھنا' تسبیحات یا ذکر و اذکار وغیرہ۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں' لیکن یہ حدیث بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوذرؓ! تم اس حال میں صبح کرو کہ تم اللہ کی کتاب میں سے ایک آیت سیکھ لو تو یہ تمہارے لیے سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔'' (سنن ابن ماجہ)

(iv) قرآن فہمی کو مشکل بنا کر پیش کرنا: شیطان انسان سے کہتا ہے کہ تم عربی زبان' گرامر اور متعلقہ ضروری علوم کے بغیر قرآن نہیں سیکھ سکتے۔ غور کریں کہ کتنے لوگ اُن زبانوں کا گرامر جانتے ہیں جو وہ بولتے اور سمجھتے ہیں؟ ہمیں تو اپنی مادری زبان کے گرامر پر بھی دسترس نہیں ہوتی' پھر ہم صرف قرآن سمجھنے کے لیے گرامر اور علوم جاننے کی شرط کیوں لگائیں؟ اگر گرامر سیکھ لیں تو بہت اچھا' لیکن نہیں سیکھا ہو تو یہ قرآن نہ سیکھنے کا بہانہ نہیں ہوسکتا۔

(v) استاد کے بغیر قرآن نہیں سیکھا جاسکتا: شیطان ہمیں یہ بھی باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ استاد کے بغیر قرآن نہیں سیکھا جاسکتا۔ یہ بات کسی حد تک تو یقیناً درست ہے لیکن کسی وجہ سے استاد میسّر نہ ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قرآن سیکھنے کی کوشش کرنا ہی چھوڑ دیں۔ ہمیں کسی بھی تفسیر سے قرآن سیکھنے کی انفرادی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ چند افراد مل کر اجتماعی مطالعے کا بندوبست کریں (تفصیل آخر میں دے گئی ہے) لیکن یہ بات ذہن میں رہے

کہ ہم نے تفاسیر پڑھنی اور سیکھنی ہیں‘ خود سے کوئی تشریح/تفسیر نہیں کرنی۔

(vi) **غیر ضروری اور فلسفیانہ مباحث میں الجھا دینا:** انسان جب اللہ کے فضل سے شیطان کے ان حربوں کو ناکام بنا دیتا ہے اور قرآن سیکھنا شروع کر دیتا ہے تو شیطان ایک اور خطرناک حملہ کرتا ہے۔ وہ انسان کو ایسی غیر ضروری بحثوں میں الجھا دیتا ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً اللہ کی کرسی‘ جنت و دوزخ اور برزخ کی حقیقت وغیرہ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ﴾ (آل عمران:۷)

’’وہی (اللہ) ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے‘ اس میں (ایک تو) آیاتِ محکمات ہیں‘ جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے‘ وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔‘‘

شیطان محکمات کی بجائے انسان کو متشابہات اور عملی زندگی کے لیے غیر ضروری مباحث میں الجھا دیتا ہے۔ اقبالؒ نے شیطان کے اسی حربے کو شیطان کی زبانی یوں بیان کیا ہے: ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے!

(ج) عربی سیکھنا

عربی زبان سیکھنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے‘ یہ ایک احسن کام ہے‘ لیکن اگر کسی کو عربی نہیں آتی تو یہ قرآن نہ سیکھنے کا بہانہ نہیں ہوسکتا۔ علماء کرام کا ہم پر بہت احسان ہے کہ تقریباً ہر زبان میں قرآن کے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ عربی سمجھنا فی نفسہٖ مقصد نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھ جائیں اور اس پر عمل کی فکر کریں۔ کیا ابولہب‘ ابوجہل‘ ولید بن مغیرہ‘ عمرو بن معدیکرب جیسے ادیب اور لبید جیسے شاعر کو عربی نہیں آتی تھی؟ جب ان کا مقصد قرآن سمجھ کر اسے دل میں اتارنا اور اس پر عمل کرنا نہیں تھا تو ’’عربی دان‘‘ ہونے کے باوجود گمراہ ہی رہے۔ یہی مسئلہ مستشرقین کا بھی ہے۔

قرآن سمجھنے کا اصل معیار (standard)

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ﴾ (العنکبوت:۴۵)

’’بے شک نماز بے حیائی سے اور فحش کاموں سے باز رکھتی ہے۔‘‘

یعنی نماز کا اصل معیار یہ ہے کہ ایک مسلمان پر یہ اثر ہو کہ وہ فحاشی اور بے حیائی سے رک جائے۔ ہمیں اپنی نماز کو اس معیار کا بنانے کی کوشش کرنی ہے۔ اسی طرح قرآن کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب ایک مسلمان قرآن پڑھے تو اس پر کیا اثرات ہونے چاہئیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲﴾ (الانفال)

’’سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے ربّ پر اعتماد رکھتے ہیں۔‘‘

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر:۲۳)

’’اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا جو ایسی کتاب ہے جس کی آیات آپس میں ملتی جلتی ہیں‘ جو بار بار دہرائی جاتی ہیں‘ اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں‘ پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔‘‘

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۳﴾ (المائدۃ)

’’جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول (ﷺ) پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوجاتی ہیں‘ اور کہتے ہیں کہ: پروردگار! ہم ایمان لے آئے‘ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔‘‘

یہ ہے قرآن پڑھنے کا اصل معیارِ مطلوب کہ جب مسلمان قرآن پڑھیں تو ان کے دل کی کیفیت ایسی ہو جو ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔ کیا قرآن پڑھتے وقت ہمارے دل لرزتے‘ رونگٹے کھڑے ہوتے یا آنکھوں سے آنسو اُمڈتے ہیں؟ یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ہم قرآن سمجھ کر پڑھیں۔

قرآن کا اجتماعی مطالعہ (کلاس کا طریقہ کار)

استاد میسّر ہو تو اس سے سیکھنا افضل ہے‘ لیکن اگر کسی وجہ سے استاد میسر نہ ہو‘ تو سیکھنے کا ایک نہایت فائدہ مند طریقہ اجتماعی قرآن کلاس ہے۔ ہم بارہ سال سے زیادہ عرصہ سے اس طریقہ کے مطابق قرآن سیکھ رہے ہیں اور اسے بہت ہی مفید پایا ہے۔ اس سے قرآن کے ایسے پہلو اور گوشے سامنے آجاتے ہیں جو انفرادی مطالعہ میں اکثر کھل کر سامنے نہیں آتے۔ یہ بات ضروری ہے کہ شرکاء دل کی دنیا صاف کر کے شریک ہوں تاکہ قرآن کی امانت اٹھانے کے لیے صلاحیت پیدا ہو اور بیان کردہ مطلوبہ اثرات مرتب ہوں۔ شرکاء میں یہ ذہنی ہم آہنگی ہو کہ ہم قرآن کا مطالعہ صرف علم کے لیے نہیں بلکہ اپنے فائدے اور عمل کے لیے کر رہے ہیں۔

(۱) چند افراد مل کر گروپ بنائیں۔ بہتر ہے کہ تعداد بارہ سے زیادہ نہ ہو‘ افراد زیادہ ہوں تو دو گروپوں میں تقسیم کر لیں۔

(۲) ہر فرد کو ایک تفسیر تفویض کی جائے جس سے وہ مقررہ آیات کا پہلے سے مطالعہ کر کے آئے‘

(۳) ہر ہفتے کم از کم ایک رکوع کا مطالعہ کیا جائے۔

(۴) مطالعہ میں عصر حاضر کے حالات جبکہ فقہی مسائل کے بارے میں جدید تفاسیر کے ساتھ قدیم تفاسیر کو بھی شامل کریں۔

(۵) کلاس کی ابتدا میں ایک فرد اپنی مقرر کردہ تفسیر سے رکوع کی تلاوت‘ رواں ترجمہ‘ الفاظ کے معانی اور رکوع کا عمومی پیغام بیان کرے۔ یہ کام ہر شریک اپنی باری پر کرے گا۔

(۶) الفاظ کے لغوی معانی کسی کتاب سے اختصار کے ساتھ بیان کریں‘ آیت میں لفظ کے متعلقہ اصطلاحی معنی واضح کیے جائیں۔ زیادہ تفصیلات سے گریز کیا جائے تاکہ قرآن سیکھنے کا اصل ہدف دھندلا نہ جائے۔ عملی معانی پر خصوصی غور و فکر کیا جائے۔ اس سے مراد کسی لفظ یا الفاظ کو اس تناظر میں سمجھنا ہے کہ میری عملی زندگی سے اس کا کیا ربط اور تعلق (application relevance) ہے! مثلاً ہم ’’اللہ اکبر‘‘ کے معانی کرتے ہیں: ’’اللہ سب سے بڑا ہے۔‘‘ یہ سوچا جائے کہ کیا میں عملی زندگی میں اللہ کو واقعی ’’اکبر‘‘ سمجھتا ہوں! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں پولیس کے سپاہی کے اشارے پر تو رک جاتا ہوں لیکن اللہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اس راستے کی طرف مت جاؤ لیکن میں نہیں رکتا؟ کیا نعوذ باللہ عملاً

میرے نزدیک اللہ کی بجائے پولیس کا سپاہی تو اکبر نہیں ہے؟ یہ اللہ اکبر کا عملی معنی ہے۔

(۷) متعلقہ فرد کی تشریح کے بعد ہر ممبر اپنی زیر مطالعہ تفسیر سے اس رکوع میں فکر و عمل کے حوالے سے پیغام شرکاء سے شیئر کرے۔ پھر تمام شرکاء بحث میں حصہ لیں تاکہ رکوع کا پیغام کھل کر سامنے آجائے۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی فرد کی طرف سے بیان شدہ تفصیلات دوبارہ بیان نہ کی جائیں تاکہ وقت کا بہتر استعمال ہو سکے۔

(۸) عصری حالات کے تناظر میں رکوع کے پیغام پر غور و فکر کریں اور اہم نکات نوٹ کر لیں۔ مطالعہ میں جو نکات تفصیل طلب رہ جائیں اور جن کا جواب زیر مطالعہ تفاسیر میں نہ ملے تو اپنے طور پر کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہ کیا جائے‘ بلکہ ہر فرد بعد میں ان نکات کی تفصیل اور وضاحت کے لیے علماء کرام سے رجوع کرے۔ ان کی بتائی ہوئی تشریح اگلی میٹنگ میں شیئر کر کے حتمی تشریح پر اتفاق کیا جائے۔

(۹) عملی نکات: یہ مطالعہ کا سب سے اہم کام ہے۔ زیر مطالعہ آیات میں اپنی زندگی میں عمل کے لیے نکات کی نشان دہی کریں اور ان کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ ایک مقررہ فرد رکوع کا عمومی پیغام اور عملی نکات لکھ کر گروپ میں شیئر کرے۔ بعد میں کسی مستند عالم سے نظر ثانی اور تصدیق کروالیں تو بہتر ہوگا۔

اس طریق کار کے مطابق سورۃ العنکبوت‘ رکوع ۱ کے عملی نکات بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) مسلمان مشکلات و مصائب سے مایوس نہ ہوں۔ یاد رکھیں دنیا میں مشکلات مؤمنوں کے لیے عذاب نہیں بلکہ انہیں کندن بنانے اور اجر دوبالا کرنے کے لیے آتی ہیں۔ ہر حال اور مشکل میں دعوت و اقامتِ دین کا کام جاری رکھیں۔

(۲) مسلمان حق پر استقامت سے قائم رہیں تو بالآخر اللہ ان کو دنیا میں فتح یاب کرتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم اس زمانے میں بھی دیکھ رہے ہیں۔

(۳) بعض اوقات نزدیک ترین لوگ بھی دین میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ان کو کھلم کھلا بتا دیا جائے کہ دین کی بنیادوں پر کوئی سمجھوتا نہیں ہو سکتا‘ چاہے وہ ناراض ہو جائیں۔

(۴) یہ بڑی تسلی کی بات ہے کہ مؤمنوں سے بشری کمزوری کی وجہ سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اللہ معاف کر دیتا ہے‘ البتہ کوشش کی جائے کہ گناہ سے اجتناب کیا جائے اور توبہ و

استغفار کی طرف توجّہ دی جائے۔

اس طرح جو عملی نکتہ/حکم سمجھ آتا جائے اس کے مطابق عمل کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتے جائیں۔ یہی وہ بات تھی جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی اور ایک جاہل قوم دنیا کی مہذّب ترین قوم بن گئی تھی۔ مسلمان قرآن اسی طرح پڑھیں جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پڑھتے اور سمجھتے تھے تو آج بھی ویسی ہی تبدیلی آسکتی ہے جیسے ان کی زندگی میں آئی۔ صاحبِ ''تفہیم القرآن'' نے یہی بات یوں بیان فرمائی ہے:

''اسے (قرآن) تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب آپ اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی ہے اسی طرح قدم اٹھاتے جائیں۔ قرآن کے احکام' اس کی اخلاقی تعلیمات' اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول وقوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک وہ عملاً ان کو بَرت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد رکھا اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہوسکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔''

(مقدّمہ' جلد اول' ص ۳۴ و ۳۵)

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو' ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

قرآن: کتابِ ہدایت وانقلاب

ڈاکٹر ضمیر اختر خان

اعوذ باللّٰہ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ﴿۲۸﴾﴾ (الفتح)

﴿ھُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡھُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ ۚ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲﴾﴾ (الجمعة)

ان دونوں آیات کی تفسیر وتشریح بہت ہی عمدہ اور خوبصورت ہے۔ ایک میں نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے' اور دوسری میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے اُس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو اساسی منہاج اختیار فرمایا وہ بیان ہو رہا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کے لیے ہدایت کا بندوبست کیا ہے اور یہی ہدایت آج ہمارا موضوع ہے یعنی قرآن' کتابِ ہدایت۔ اس کے بعد انقلاب کا لفظ صرف دورِ حاضر میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ چونکہ اس لفظ کو بہت زیادہ استعمال کیا گیا اور اس کا غلغلہ بھی بہت زیادہ ہے اور لوگ اس لفظ سے مانوس بھی بہت ہیں' تو اس لیے ہم اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں' ورنہ یہ کوئی قرآن وحدیث کا لفظ نہیں ہے۔ یہ ہر دور کی ایک مجبوری ہوتی ہے کہ اس وقت کے محاورے کے مطابق گفتگو کرنی چاہیے' ورنہ اس انقلاب کے لفظ کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس آیت میں ارشاد فرما رہے ہیں:

﴿لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ﴾

''تاکہ وہ اس دین کو غالب کر دے''

اگر ''ہ'' کی ضمیر سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ مراد لیں تو ترجمہ ہوگا: ''اللہ غالب کر دے۔'' اُس نے

اپنے دین کو مکمل کر دیا' کیا کوئی روک سکا؟ اس نے اپنے نورِ ہدایت کو مکمل کیا' کیا کسی نے روکا؟ اور اگر ''ہ'' ضمیر ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف' تو انہوں نے جب اس دین کو غالب کرنے کی کوشش کی تھی تو ان کو روکا گیا۔ ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں' ان کو طرح طرح کے مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا میرے خیال میں یہاں جو ''ہ'' کی ضمیر ہے' وہ جناب محمد ﷺ کی طرف ہی ہے۔ وجہ اس کی سمجھ میں بھی آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فاعلِ حقیقی ہے' اس کے سامنے کون سی چیز ایسی ہے جو مشکل ہے؟ وہ ذات تو ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کی شان سے اپنے دین کو غالب کر سکتا تھا' لیکن اللہ نے یہ ذمہ داری اپنے نبی کریم ﷺ کے سپرد کی تھی۔

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے! ویسے تو ضروریات کے انبار ہیں۔ آج ہر کوئی انہیں حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگا ہوا ہے' بلکہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت بلکہ نعمت قرآن مجید ہے۔ یہ ہدایت کا منبع و سرچشمہ ہے۔ دو کام ہیں: تکمیلِ قرآن اور غلبۂ دین۔ غلبۂ دین کا کام محمد ﷺ سے لیا گیا اور قرآن مجید کی اللہ نے خود تکمیل کر دی ہے۔

اب دوسرے لفظ انقلاب کی طرف آتے ہیں۔ پوری تاریخ انسانی میں کامل ترین انقلاب کا داعی اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' اپنی پوری شان کے ساتھ۔ ویسے تو آج ہر کوئی انقلابی بنتا ہے' جمہوری انقلابی بھی موجود ہیں۔ انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہج/منہاج' ہمارے موضوع کا دوسرا پہلو ہے۔ قرآن مجید کتابِ انقلاب ہے۔ حضور ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا اس کی بنیاد کون سی چیز تھی؟ کون سی چیز آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے اندر انڈیلی؟ ان کے دل اور دماغ کو کس چیز کے اوپر راسخ کیا' کہ وہ انقلاب برپا ہو گیا؟ ظاہر ہے قرآن مجید! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اپنی فکر کی آبیاری کے لیے قرآن کے ساتھ اتنی گہری وابستگی رکھیں کہ لوگ ہمیں مجنوں کہیں۔ ہم ایک انقلابی جماعت میں شامل ہوئے ہیں' اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ کوشش نہیں کی تو اللہ ہم سے پوچھے گا' اللہ تعالیٰ ہمیں بچائے اس گھڑی سے' کہ: اچھا' تم نے بہت بڑا دعویٰ کیا تھا' تو کیا کر کے آئے ہو؟

اگر غور کیا جائے تو انسان کی ضرورتیں بے شمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انسان کو کچھ قواعد وضوابط کا پابند بنایا ہے۔ اگر وہ ان کو اختیار کر کے اپنی

ضرورتوں کو پورا کرے‘ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ البتہ ایک بنیادی ضرورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنے اندر کو ٹھیک کرے۔ سب سے پہلے اس کا دل ٹھیک ہونا چاہیے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ علامہ اقبال سے معذرت کرتے ہوئے ع ’’سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف‘‘ کی بجائے ’’خاکِ حجاز وحولِ قدس‘‘ کہا کرتے تھے۔ حولِ قدس اور خاکِ حجاز سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے‘ وہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت نبی اکرم ﷺ نے بایں طور فرمائی ہے:

((أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً ، إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)) (متفق عليه)

’’سن لو! انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوگا تو سارا بدن درست ہوگا‘ اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ سن لو! وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے۔‘‘

پھر اسی دل کے بارے میں فرمایا:

((إِنَّ هَذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ.)) قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةِ الْقُرْآنِ)) (رَوَاه الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ)

’’یہ دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا پانی لگنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔‘‘ عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! ان کی چمک کس طرح آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت کرنا۔‘‘

بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ لطیف پیرائے میں بتاتے تھے کہ ہماری پی آئی اے نے جب عربوں کی دیکھا دیکھی سفر کی دعا پڑھنا شروع کی کہ:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝۱۳ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۴﴾ (الزخرف)

تو موت سے الرجک ہمارے کچھ لوگوں نے کہا کہ دعا کو بس پہلی آیت تک رکھا کریں‘ اس لیے کہ دوسری آیت کے بعد تو جہاز میں بیٹھتے ہوئے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ آپ تو ہمیں پہلے ہی موت کی طرف لے جا رہے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید سے موت کی یاد دہانی نہ کرائی جائے کہ موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے۔ کسی بھی وقت عزرائیل تمہیں

اچک سکتا ہے اللہ کے حکم سے۔ بہرحال یہ ضرورتیں تو اپنی جگہ ہیں‘ لیکن اصلاحِ دل کو ہمیں اپنی اولین ضرورت سمجھنا چاہیے۔ ہم دوبارہ اپنے مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی انسان پر سب سے بڑی نعمت کون سی ہو سکتی ہے؟ سورۃ الرحمٰن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ بار بار فرماتے ہیں: ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝﴾ ’’تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟‘‘ سورۃ النحل میں بھی فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ﴾ (آیت ۱۸)

’’اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے۔‘‘

یعنی تم کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اور کس کس نعمت کو تم شمار قطار میں لا سکتے ہو؟ اس کی تو تم گنتی بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام نعمتوں کو یکجا کیجیے تو ان میں سب سے غالب اور سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے۔ اگر ہدایت نہیں تو ساری نعمتیں زحمت بن جائیں گی۔ اس لیے اس کا احساس اور ادراک ہونا چاہیے۔ حضور اکرم ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے:

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ۝۵۸﴾ (یونس)

’’کہہ دیجیے: (یہ سب) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے سبب ہے‘ پس انہیں چاہیے کہ وہ اس پر خوش ہوں۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں۔‘‘

یہ قرآن وہ نعمت ہے جس پر کوئی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے‘ اور اس کو واقعتاً فخر کرنا بھی چاہیے۔ جو کچھ تصور ہو سکتا ہے دنیا کی نعمتوں کا‘ ان سب سے بڑھ کر یہ قرآن نعمت ہے۔ جن نعمتوں کے حوالے سے ہم کبھی کبھی پریشان ہو جاتے ہیں‘ کبھی صحت کا معاملہ ہوتا ہے‘ کبھی بیوی بچوں کے معاملات ہوتے ہیں‘ کبھی کچھ اور پریشان کن معاملات ہو جاتے ہیں‘ تو قرآن مجید جیسی بڑی نعمت کا تصور آتے ہی جو چیزیں ہماری پاس ہیں‘ ہم ان پر اکتفا کر کے ہمیشہ ہشاش بشاش اور صحت مند رہیں گے‘ ان شاء اللہ۔ کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوگا۔ اس بڑی نعمت کا احساس ہمیں ہر پریشانی سے بچائے گا۔ ہر دوسری نعمت کی قدر کرنا قرآن کی نعمت ہمیں سکھائے گی۔

قرآن مجید نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے۔ کاش اُمّتِ مُسلمہ بھی اس بات کو سمجھتی۔ یہ جو گلوبلائزیشن ہوئی ہے‘ یہ اُمّت پوری انسانیت کو اس نعمت ہدایت سے مستفید کر سکتی تھی‘ لیکن

بدقسمتی ہے کہ اُمّت سو رہی ہے۔ نتیجتاً انسانیت اس ہدایت سے محروم ہے۔ اللہ جل جلالہٗ نے اس قرآن کو ھُدًی لِّلنَّاسِ کہا ہے۔ پھر اس ہدایت سے جو لوگ مستفید ہوں گے ان کو بھی بتایا جا رہا ہے کہ اگر کوئی اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہتا ہے' تو ضرور کرے' ورنہ بہت بڑا خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ انسانیت کو لازماً تقویٰ کی راہ پر آنا ہوگا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قرآن کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ بھی کہا ہے' یعنی یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ تقویٰ کا حصول اس ہدایت سے استفادے کی شرط لازم ہے۔ کیا تقویٰ کسی خاص ہیئت کا نام ہے؟ کسی خاص لباس یا خاص وضع قطع کا نام ہے؟ یقیناً یہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم ہو سکتی ہیں' لیکن تقویٰ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ فضا دنیا میں قائم کرنا کہ ہر شخص کا تعارف اللہ سے ہو جائے۔ ہر برائی دب جائے' ہر اچھائی عام ہو جائے۔ اگر یہ نہیں ہے اور باطل کا غلبہ ہے تو پھر تقویٰ کی آرزو کرنا اپنے آپ کو فریب اور دھوکا دینے کے مترادف ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی ہدایت دی ہے نبی اکرم ﷺ کو' جن کا منصب یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے قرآن کی تعلیمات کو کھول کر سادہ انداز میں بیان کریں۔ اللہ کا کلام تو ایک شاہانہ انداز ہے جب کہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے آپ ﷺ ہماری زبان میں ہی ہمیں سمجھا رہے ہیں۔ حضور ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہمیں ایسے محسوس ہو جیسے یہ ہمارے دل کی آواز ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب فتنوں کی یلغار ہوگی۔ ان آزمائشوں اور فتنوں سے نکلنے کے لیے حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اس کتاب ہدایت کی طرف متوجہ فرمایا' اہلِ ایمان کو بالخصوص تاکہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی متوجہ کریں کہ فتنوں سے بچنا چاہتے ہو تو یہ ہے راستہ۔ چنانچہ حدیث کے راوی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جب یہ دریافت کیا: مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((کِتَابُ اللّٰهِ)) اللہ کی کتاب ہے فتنوں سے بچنے کے لیے۔

((کِتَابُ اللّٰهِ، فِیْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ، هُوَ الْفَصْلُ لَیْسَ بِالْهَزْلِ، مَنْ تَرَکَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ))

''اللہ کی کتاب —— اس میں تم سے پہلے (کی اُمتوں) کی خبریں ہیں' تمہارے بعد

(آنے والے واقعات) کی اطلاع ہے' اور تمہارے درمیان فیصلے کرنے کا حکم ہے۔ یہ فیصلہ کن (کلام) ہے' کوئی کھیل تماشا نہیں۔ جو بھی سرکش اسے چھوڑ دے' اللہ اسے ہلاک کر دے گا۔''

ہمیں اللہ تعالیٰ نے توفیق دی۔ اللہ کے ایک بندے ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ذریعے سے ہم اس قرآن سے وابستہ ہوئے۔ رجوع القرآن کی تحریک سے ہم واقف ہیں۔ ہمارا تعلق اگر قرآن سے نہیں جڑتا تو ایسا ہماری کاہلی' سستی یا شیطان کے وار کی وجہ سے ہے۔ شیطان کا بھی اگر ہم مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں تو پھر ہم کیسے مجاہد ہیں! یہ بہت غور طلب اور ڈرنے کی بات ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو' اس حدیث کا ہمارے اوپر اطلاق ہو جائے کہ ہم قرآن کو اہمیت نہیں دے رہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا:

وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِیْ غَیْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ، وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ ' وَهُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ، هُوَ الَّذِیْ لَا تَزِیْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ، وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ، وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهُ، هُوَ الَّذِیْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾

''اور جس نے ہدایت کو اس (قرآن) کے علاوہ کہیں اور تلاش کیا' اللہ اسے گمراہ کر دے گا۔ یہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے' یہی حکمت بھری نصیحت ہے' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہ وہ (کتاب) ہے جس سے خواہشات بھٹکتی نہیں' زبانیں اسے خلط ملط نہیں کر سکتیں' علماء اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے' زیادہ پڑھنے سے یہ پرانا نہیں ہوتا' اور اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ وہ (کتاب) ہے جسے جب جنوں نے سنا تو کہنے لگے: ''بے شک ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔''

یہ ہے وہ ہدایت جس کی ہمیں قدر کرنی ہے۔ اب ہم اپنے دوسرے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے اور اسی ہدایت کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر مکمل کیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔''

﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ﴾

''اور اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے والا ہے۔''

تو اس میں آپ ﷺ کی بعثت کا بھی فوری طور پر ذکر کر دیا تاکہ اتمامِ نور اور اتمامِ ہدایت کا تقاضا اہلِ ایمان کے سامنے رہے۔ سورۃ الصّف میں ارشاد ہوا:

﴿یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۸﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں' حالانکہ اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا' چاہے کافر ناپسند کریں۔''

یہی مضمون سورۃ التوبہ (آیت ۳۲) میں قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ آیا۔ اس کے بعد دونوں مقامات پر اگلی آیت میں فرمایا:

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۹﴾ (الصف)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کر دے پورے نظامِ حیات پر خواہ یہ مشرکوں کو ناگوار گزرے۔''

حضور ﷺ کی کوشش ہوتی کہ جبرائیل علیہ السلام جب آپ ﷺ کو قرآن سناتے تھے تو آپ ﷺ جلدی جلدی دہراتے رہتے تاکہ ان کے جانے سے پہلے پہلے اس کو یاد کر لیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا آپ فکر نہ کیجیے:

﴿اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَقُرۡاٰنَہٗ ۱۷﴾ (القیامۃ)

''ہمارے ذمے ہے اس کا پڑھوانا بھی اور جمع کرانا بھی۔''

اس کا مطلب ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اس مشقت سے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکالا۔ جو کام حضور اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے لینا تھا اور جو آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد مقرر ہوا' وہ اللہ کے دین کو اس زمین کے اوپر غالب کرنا تھا۔ یہ وہ مشکل کام تھا جس کے لیے نبی اکرم ﷺ نے دن دیکھا نہ رات دیکھی اور اپنے آپ کو اس کام میں لگا دیا' تب جا کر اللہ کا دین غالب ہوا۔ آپ ﷺ نے اس پر اللہ کو گواہ بھی بنا لیا: ''اے اللہ! یہ میرے ساتھی بھی گواہی دے رہے ہیں' مَیں نے نہ صرف پہنچایا بلکہ ان کے سامنے اس کا عملی مظاہرہ بھی پیش کر دیا ہے۔ صرف میں

نے ابلاغ ہی نہیں کیا' صرف تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ اس دین کے لیے اللہ کے دشمنوں کو زیر بھی کیا ہے اور ان کے ساتھ لڑا بھی ہوں' میدانِ جنگ میں بھی اترا ہوں۔ اے اللہ! تو بھی اس پر گواہ رہنا!''

یہ سارے کام حضور ﷺ نے کیے ہیں۔ اب ایک عرصہ بیت گیا ہے کہ اللہ کا دین مکمل طور پر زمین بوس ہے۔ پوری عمارت جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے کھڑی کی تھی' گری پڑی ہے۔ اللہ کا دین غالب کر کے نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کے سپرد کر دیا اور ان میں سے جو چار خلفائے راشدین تھے' انہوں نے اس غلبہ کو مستحکم کرنے کا حق بھی ادا کر دیا۔ لہٰذا ان کا دور عین نبوت کے طریق پر ہے' یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ۔ ان کے بعد ایک عرصہ تک شکستہ حالت میں دین کی عمارت کھڑی رہی' تاہم ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو وہ بھی دھڑام سے گر پڑی اور خلافت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ آج اللہ کا دین مغلوب ہے۔ اب اس اُمّت سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ میں نے اپنے وعدے پورے کیے' تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اپنے نبی کے ساتھ وفاداری نبھاؤ۔ اس وقت دنیا میں اگر باطل غالب ہو' حق مغلوب ہو جبکہ اُمّت مزے کر رہی ہو' مسلمان اپنے اپنے کاموں میں پھنسے ہوئے ہوں' دنیا کے معاملات اور مسائل کو دنیاوی معیارات کے مطابق حل کرنے کے لیے سوچ بچار کر رہے ہوں تو پھر یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ وفاداری نہیں ہے۔ اس دین کے لیے حضور ﷺ کا خون بہا۔ کیا یہ باتیں ہمیں یاد آتی ہیں اور اس وقت ہم تڑپ جاتے ہیں؟ تکمیلِ نور تو ہو چکی' تکمیلِ دین نظری طور پر بھی ہو گئی اور جزیرۃ العرب کی حد تک عملی طور پر دین غالب بھی ہو گیا۔ اب عالمی سطح پر اس کو مکمل کرنا اس اُمّت کی ذمہ داری ہے۔ ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہماری فکر کی بنیاد میں قرآن مجید موجود ہے۔ گو کہ ہم کم کوش ہیں' محنتی نہیں ہیں' لیکن الحمدللہ یہ ہمارے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔

جب بنیاد میں قرآن ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ پانی موجود ہو تو وہاں سے کوئی نہ کوئی ہریالی کسی نہ کسی درجے میں پھوٹے گی' ان شاء اللہ۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے اور اس کی ہم نے قدر کرنی ہے۔ اب یہیں سے ہم طے کر کے اٹھیں کہ' ان شاء اللہ' ایک پارہ روزانہ تلاوت کریں گے۔ یہ ہمیں گراں نہیں گزرے گا۔ ہم روزانہ تلاوت کر کے سوئیں گے۔ جس دن ہم نے تلاوت نہ کی ہو تو ہمیں بالکل ایسے ہی محسوس ہونا چاہیے جیسے آج کھانا نہیں کھایا۔ ہمیں کوئی کمی محسوس ہو رہی ہو۔

منہجِ نبوی ﷺ ایک پورا انقلابی پروسیس ہے۔ جو چھ مراحل ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' میں بیان ہوئے ہیں‘ ہم ان سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ ان میں سے ایک اساسی منہج کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا کہ وہ رجالِ کار‘ وہ جواں ہمت لوگ‘ وہ مردانِ خود آگاہ وخدا مست‘ وہ تیار کیسے ہوئے تھے۔ ان کو بنایا کیسے حضور اکرم ﷺ نے۔ ایسی نرالی شان والے نہ تاریخ نے پہلے کبھی دیکھے تھے‘ نہ بعد میں کبھی ویسے نظر آئیں گے۔ وہ کیسے وجود میں آئے تھے؟ اس کی وضاحت کے لیے دوسری آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی تھی:

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (الجمعۃ:۲)

''وہی تو ہے جس نے اٹھایا اُمّیین میں ایک رسول اُن ہی میں سے‘ جو اُن کو پڑھ کر سناتا ہے اُس کی آیات اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب وحکمت کی۔''

چار کام کیے حضور ﷺ نے صحابہ کرام پر۔ جن پر کام کیا گیا وہ انبیاء کے بعد اس دھرتی کے اوپر سب سے بہترین انسان بن گئے! رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ بھی ان سے راضی ہو گیا۔ عرب کے اس ماحول میں ان کی زندگیاں گزر گئی تھیں‘ لیکن ان کی شان یہ تھی کہ ع: ''خود نہ تھے جو راہ پہ اوروں کے ہادی بن گئے۔'' وہ کس وجہ سے بنے؟ انہوں نے چار کام کیے اور ان چاروں کی حیثیت بنیاد‘ مرکز یا محور کی سی ہے۔

چنانچہ توجہ کیجئے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ کی طرف۔ تلاوتِ آیات۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب تلاوت کیا کرتے تھے تو اس کا مفہوم بھی سمجھ رہے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی سمجھ کر تلاوت کرنی چاہیے‘ اگرچہ مجرد تلاوت کو بھی معمولی کام نہ سمجھیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ تلاوت تو بغیر ترجمہ کے‘ بغیر فہم کے بے کار ہے۔ یہ بہت ہی غلط سوچ ہے۔ فہم اپنی جگہ ایک بہت بڑا اور مستقل موضوع ہے اور ہمارے لیے یہ کوئی اجنبی چیز بھی نہیں ہے‘ لیکن قرآن کے ساتھ صرف ایک لگاؤ بھی بہت بڑی بات ہے۔ حضور ﷺ سے بڑھ کر قرآن کا فہم رکھنے والا کوئی شخص نہیں ہو سکتا‘ لیکن آپ ﷺ کو بھی حکم دیا گیا:

﴿ اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ ﴾ (العنکبوت:۴۵)

''آپ پڑھتے رہا کیجئے جو کچھ آپ کی طرف کتاب میں سے نازل کیا گیا ہے۔''

اور آپ اس کا حق کس طرح سے ادا کر رہے ہیں؟

﴿ یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴿۴﴾ ﴾

''اے اوڑھ لپیٹ کر لینے والے! رات کو (نماز کے لیے) قیام کرو سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو‘ یا اس پر کچھ بڑھا دو‘ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر (صاف انداز میں) پڑھو۔''

یہ ہے‘ حضور اکرم ﷺ کا اسوہ۔

اس کے بعد دوسری چیز ہے: ''تزکیہ۔'' آج ہم جب تک تزکیہ کے ساتھ ''نفس'' کا لفظ نہ لگائیں تو شاید بات مکمل نہیں ہوتی۔ ہم کہتے ہیں: ''تزکیۂ نفس۔'' قرآن مجید میں ''نفس'' کا ذکر ان آیات کے ساتھ نہیں آیا‘ البتہ دیگر مقامات پر آیا ہے۔ جیسے سورۃ الشمس میں فرمایا گیا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ﴿۸﴾ ﴾

یہاں خصوصی طور پر کیوں اس تزکیہ کا ذکر کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلابی فکر سب سے پہلے دل اور دماغ میں راسخ ہونی چاہیے۔ اگر دل و دماغ میں یہ فکر راسخ ہو گی تو پھر انسان عملاً متحرک ہو گا‘ motivate ہو گا۔ اگر کسی شخص کو یہ بتایا جائے کہ آپ کے والد پر حملہ ہو گیا ہے تو وہ دائیں بائیں ہو کر فوراً پہنچے گا۔ اپنے والد کو ریسکیو کرے گا کہ نہیں؟ آج اللہ کا دین سرنگوں ہے‘ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا لگایا ہوا پودا زمین بوس ہے اور ہم تزکیہ کا طریقہ لے کر کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر اللہ ہو‘ اللہ ہو‘ اللہ ہو کرتے رہیں۔ محمد ﷺ نے کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ورد نہیں کیا۔ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے''۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح اُس کے علاوہ کسی اور کے سامنے سجدہ نہیں ہو سکتا‘ اسی طرح اس کے علاوہ کسی اور کی اتھارٹی بھی تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اُس کے علاوہ کوئی اور حاکم نہیں ہے۔ اُس کے علاوہ کسی اور کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنی بات دوسروں سے منوائے۔ اللہ ہی کی طاقت ہے‘ اس کے سامنے سب جھک جائیں۔ تزکیہ کو ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت خوبصورت طریقے سے سمجھایا کہ انسان جب قرآن کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کا اندر بدل جاتا ہے۔ بانی محترم علامہ اقبال کا سہارا لے کر کہتے ہیں:

چوں بجاں دَر رَفت جاں دیگر شَوَد
جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شَوَد!

جب قرآن کسی کے اندر اترتا ہے‘ تو اس کے اندر کو بدل دیتا ہے۔صرف ایک جان نہیں بدلتی‘ صرف ایک individual نہیں بدلتا‘ بلکہ وہ پورے جہاں کو بدلنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ ہے تزکیہ کا اصل مفہوم۔علامہ اقبال کہتے ہیں:ؔ

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

آیات کی تلاوت‘ تزکیہ‘ تعلیم کتاب‘ تعلیم حکمت کا اوّلین مصداق قرآن مجید ہے۔تاہم‘ اس کے ساتھ ہم سُنّتِ رسول اور حدیثِ نبوی ﷺ کو بھی جوڑتے ہیں۔اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن جیسی ہدایت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو انقلابی فکر ’’اظہارِ دین‘‘ کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری سمجھ میں آئی ہے‘ اس پر خود عمل کرتے ہوئے جِدّوجُہد کریں۔شاید دور تک ہمیں کوئی اثرات نظر آجائیں کہ انقلاب آرہا ہے۔اگر ہماری زندگی میں نہ بھی آیا‘ پھر بھی ہم سرخرو ضرور ہوں گے‘ ان شاء اللہ!

(تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع ۲۰۲۴ء میں کیا گیا خطاب)

❁❁❁

ماھنامہ ”میثاق“ لاھور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزّہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

تلاوتِ قرآن اور اُسوۂ صحابہؓ

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی

انسانی تاریخ کے عجائب میں سے ہے کہ ایک ایسی قوم جو تہذیب وتمدن سے یکسر نا آشنا، جنگ وجدال اور لوٹ مار کی خوگر اور حلال وحرام کی تمیز سے بے گانہ تھی، وہ تہذیب وشرافت اور امن وامان کی علَم بردار کیسے بن گئی! جو جہالت کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی، وہ علم کی شمعیں کیوں کر جلانے لگی؟ جس کے افراد ایک دوسرے کے خون کے اس قدر پیاسے رہتے تھے کہ صدیوں کی معرکہ آرائیوں سے بھی ان کی دشمنی کی شدت میں کمی نہ آتی تھی، وہ کیسے باہم شیر وشکر اور بھائی بھائی بن گئے، حتیٰ کہ ایک دوسرے پر اپنی جان، مال، جائیداد، گھر بار اور دوسری محبوب چیزیں نچھاور کرنے لگے؟ جن کی نجی زندگی بے حیائی، آوارگی، عریانیت اور فحاشی میں غرق رہتی تھی، وہ کیسے عفت وپاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے لگے؟

تجزیہ کرنے والے جو بھی تجزیہ کریں اور اسباب وعلل تلاش کرنے والے جو بھی توجیہات کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر یہ بنیادی تبدیلی قرآن کریم کی بدولت واقع ہوئی تھی۔ یہ قرآن ہی تھا جس نے یکسر ان کی کایا پلٹ دی تھی، ان کو ذلّت ونکبت کی کھائی سے عزّت وعظمت کے بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ انہیں جہالت کی تاریکیوں سے علم کی روشنی میں لے آیا تھا اور وحشت وسفاکیت کے خوگر ان کے مزاج کو بدل کر انہیں تہذیب وشائستگی کا امام بنا دیا تھا۔ پھر جوں جوں قرآن کریم سے ان کا تعلق کم زور ہوتا گیا، دوسری قومیں ان پر شیر ہوگئیں اور ذلّت وبے توقیری ان کا مقدر بن گئی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے کہ:

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت قرآن کریم سے اثر پزیری اور اس کے ساتھ میدانِ عمل میں

اُترنے کا اولین نمونہ ہے۔ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ان کا قرآن سے تعلق کیسا تھا! قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں اور وہ انہیں سنتے تھے تو ان پر کیا اثر ہوتا تھا؟ تلاوت کرنے اور آیات یاد کرنے کا ان کا کیا معمول تھا؟ قرآن حکیم کے احکام وتعلیمات سے انہوں نے کس طرح اپنی زندگی کو آراستہ کیا تھا؟ اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے انہوں نے کتنی جِدّوجُہد کی تھی؟ اس کا حکم نافذ کرنے اور اس کا اقتدار قائم کرنے کے لیے انہوں نے کیا قربانیاں دی تھیں؟

قرآن کریم سے تعلق کا اوّلین اظہار اس کی تلاوت سے ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کے غایت درجہ مشتاق رہتے تھے۔ وہ اپنے شب وروز کے زیادہ تر اوقات اس کی تلاوت میں گزارتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے قرآن مجید کو مختلف حصوں (احزاب) میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اوس نامی ایک تابعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ: آپ لوگوں نے قرآن کو مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس اعتبار سے ایک حصے میں کتنی سورتیں ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: تین، پانچ، سات، نو، گیارہ اور اخیر کی تمام چھوٹی سورتیں ایک حصے میں شامل ہیں۔ (۱)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کم سے کم وقت میں پورا قرآن مجید پڑھ لینا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں غلو سے روکنے اور اعتدال کی روش پر قائم رکھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے ایک موقع پر دریافت کیا: اللہ کے رسولؐ! میں قرآن کو کتنے دنوں میں ختم کروں؟ فرمایا: ایک مہینے میں۔ انہوں نے عرض کیا: مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔ فرمایا: بیس دن میں ختم کرلو۔ انہوں نے اسی طرح اور بھی کم دنوں میں ختم کر لینے پر اپنی قدرت ظاہر کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رعایت سے پندرہ دن، پھر دس دن، پھر سات دن میں ختم کرنے کی اجازت دی، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:

((اِقْرَأْ فِي سَبْعٍ وَلَا تَزِيْدَنَّ عَلٰى ذٰلِكَ)) (۲)

''سات دن میں پورا قرآن پڑھ لو، اس سے کم میں ہرگز ختم نہ کرو۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ ان کے اصرار پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تین دنوں میں قرآن ختم کرنے کی اجازت دے دی۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ وہ اس سے بھی کم وقت میں پورا

قرآن پڑھ سکتے ہیں تو آپ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا:

((لَا یَفْقَهُ مَنْ قَرَأَهُ فِی اَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ)) (۳)

''جو شخص تین دنوں سے کم وقت میں قرآن ختم کرے گا' وہ ٹھیک طریقے سے اسے سمجھ نہیں سکتا۔''

امام نوویؒ نے متعدد صحابہ' تابعین اور بعد کے دور کے بزرگوں کے نام تحریر کیے ہیں جو ایک دن میں قرآن ختم کر لیتے تھے' بلکہ ان میں سے بعض ایک دن میں دو قرآن ختم کر لیتے تھے۔ (۴) البتہ رسول اللہ ﷺ کی ناپسندیدگی کی وجہ سے ایسا کرنا غیر مسنون معلوم ہوتا ہے۔

تلاوتِ قرآن کا ایک ادب یہ ہے کہ اس کو بہت جلدی جلدی نہ پڑھا جائے۔ ایسا محسوس نہ ہو کہ سر کا بوجھ اُتارا جا رہا ہے' بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی قراءتِ قرآن میں ایک ایک حرف صاف سنائی دیتا تھا۔ (۵) یہی معاملہ صحابہ کرامؓ کا بھی تھا۔ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

''میں ترتیل کے ساتھ صرف ایک سورہ پڑھوں' یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر ہے کہ بغیر ترتیل کے پورا قرآن پڑھ لوں۔'' (۶)

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص نے کہا: میں مفصّل سورتیں سورۃ الحجرات سے سورۃ الناس تک ایک رکعت میں پڑھ لیتا ہوں۔ انہوں نے جواب دیا: هَذًّا كَهَذِّ الشِّعْرِ ! اس کا مطلب یہ ہے کہ تم قرآن کو اشعار کی طرح جلدی جلدی پڑھ لیتے ہو۔ (۷) اس موقع پر انہوں نے مزید فرمایا: ''کچھ لوگ قرآن اس طرح پڑھتے ہیں کہ وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا' حالاں کہ قرآن مجید جب دل میں اتر جائے اور اس میں جاگزیں ہو جائے تب نفع دیتا ہے۔'' (۸)

رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

((زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ)) (۹)

''قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو۔''

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَیْسَ مِنَّا)) (۱۰)

''جس شخص نے قرآن کو خوش الحانی سے نہیں پڑھا' وہ ہم میں سے نہیں۔''

اسی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے' جس سے سننے والوں پر محویت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے باہر نماز کے لیے ایک جگہ مخصوص کر رکھی تھی' جہاں بیٹھ کر وہ قرآن مجید کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ ان کی آواز سن کر مشرک عورتیں اور بچّے اکٹھے ہو جاتے اور بڑے انہماک سے قرآن مجید سنتے تھے۔ یہ دیکھ کر مشرکین اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں قرآن ان پر اپنا اثر نہ دکھانے لگے اور وہ ایمان نہ لے آئیں۔ چنانچہ انہوں نے مکہ کے بااثر سردار ابن الدغنہ سے شکایت کی' جس نے ہجرت سے قبل مکہ میں حضرت ابوبکرؓ کو جوار (امان) دے رکھی تھی۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپؓ نے اس کی جوار واپس کر دی۔ (۱۱)

خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرنے میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہرت حاصل تھی۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور دیکھا کہ ایک شخص بہت خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے۔ دریافت فرمایا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے ان کا نام عبداللہ بن قیسؓ بتایا۔ آپؐ نے فرمایا:

((اُعْطِیَ مِزْمَاراً مِنْ مَزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ)) (۱۲)

''انہیں تو نغمہ داؤدی عطا کیا گیا ہے۔''

مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہی کا اصل نام عبداللہ بن قیسؓ تھا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا:

((لَو رَأَیْتَنِی وَاَنَا اَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِكَ البَارِحَةَ، لَقَدْ اُوتِیْتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِیْرِ آلِ داوٗدَ)) (۱۳)

''میں نے گزشتہ رات تمہاری قراءت سنی' بہت متاثر ہوا۔ تمہیں تو نغمہ داؤدی عطا کیا گیا ہے۔''

ابوعثمان نہدی بیان کرتے ہیں کہ: ''میں نے چنگ و بربط کی آواز کو بھی ابوموسیٰ اشعریؓ کی خوش الحان قراءت سے بہتر نہیں پایا۔'' (۱۴) یہ صرف حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی انفرادی خصوصیت نہ تھی بلکہ ان کے پورے قبیلے کا امتیازی وصف تھا۔ ایک غزوہ کے لیے سفر کے دوران صحابہ کرامؓ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ اگلے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگرچہ میں نے دن

میں نہیں دیکھا تھا کہ اشعریوں نے کس جگہ اپنے خیمے لگائے ہیں' لیکن رات میں ان کی قرآن خوانی سن کر مجھے ان کی جائے قیام کا پتا چل گیا۔''(۱۵)

صحابۂ کرام ؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے قرآن سننے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ حضرت عمر بن الخطاب ؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپؓ ان سے فرماتے: ''ہمیں اللہ کا شوق دلاؤ۔'' وہ فوراً قراءت شروع کر دیتے۔(۱۶)

ان کی قراءت کو اُمّہات المومنین ؓ بھی نہایت شوق سے سنتی تھیں۔(۱۷) ایک مرتبہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صِدّیقہ ؓ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ انہیں گھر واپس آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ نے وجہ دریافت کی تو عرض کیا: ''آپؐ کے اصحاب میں سے ایک صاحب قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ میں نے ایسی قراءت کبھی نہیں سنی''۔ آپؐ ان کے ساتھ ہو لیے۔ دیکھا تو وہ حضرت سالم مولیٰ ابن ابی حذیفہؓ تھے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مِثْلَکَ))(۱۸)

''اللہ کا شکر ہے کہ میری اُمت میں تم جیسے لوگ موجود ہیں۔''

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبدالرحمٰن بن سائب ؓ کی قراءت سن کر ان کی تعریف کی اور فرمایا: ''تم قرآن بہت خوش الحانی سے پڑھتے ہو۔''(۱۹)

قرآن کریم نے سابقہ قوموں کے بعض اصحابِ علم کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب ان کے سامنے قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان پر گریہ و خشیت طاری ہو جاتی ہے:

﴿وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾ (بنی اسرائیل)

''اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے۔''

احادیث میں رسول اللہ ﷺ کا بھی یہی وصف مذکور ہے۔ حضرت ابوذر ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے' جب سورۃ المائدہ کی اس آیت پر پہنچے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ (المائدۃ)

''اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں' اور اگر معاف کر دیں تو آپ

غالب اور دانا ہیں۔''

تو بار بار اسی آیت کو دہراتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔(۲۰)

یہی حال تمام صحابۂ کرام ؓ کا بھی تھا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو ان پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ کوئی آیت رقت انگیز ہوتی تو اسی کو بار بار دہراتے۔ اگر مضمون عذاب سے متعلق ہوتا تو اللہ کی پناہ کے طالب ہوتے تھے۔ اکثر شدّتِ گریہ سے ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔

یمن سے کچھ لوگ حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے ملنے آئے۔ ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی گئی تو وہ رونے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''ایسا ہی حال ہمارا بھی ہوتا تھا۔''

حضرت عمر بن الخطاب ؓ نے ایک مرتبہ فجر کی نماز میں سورۂ یوسف پڑھی تو زار و قطار رونے لگے۔ دوسری روایت میں اسے عشاء کی نماز بتایا گیا ہے۔ ممکن ہے' یہ الگ الگ مواقع کا بیان ہو۔ روایت میں ہے کہ وہ اتنے زور زور سے روئے کہ مقتدی ان کی آواز سنتے تھے۔

حضرت عباد بن حمزہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ مَیں حضرت اسماء ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھیں۔ جب سورۃ الطور کی اس آیت پر پہنچیں:

﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴾

''آخر کار اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں جھلسا دینے والی ہوا کے عذاب سے بچا لیا۔''

تو اس پر ٹھہر ٹھہر کر بار بار اسی کو دہرانے لگیں اور اللہ تعالیٰ سے عذابِ جہنم سے بچانے کی دعا کرنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہیں تو میں وہاں سے نکل کر بازار چلا گیا۔ وہاں اپنی ضرورت پوری کی اور کچھ دیر کے بعد دوبارہ ان کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اسی آیت پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ بار بار اسی کو پڑھ رہی ہیں اور اللہ سے دُعا کر رہی ہیں۔

حضرت تمیم الداری ؓ ایک رات سورۃ الجاثیہ پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہنچے:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (الجاثیۃ: ۲۱)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے!''

تو مسلسل اسی کو دہراتے رہے' یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

حضرت ابورجاءؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے چہرے پر مسلسل رونے کی وجہ سے نشانات پڑ گئے تھے۔ (۲۱)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے زیادہ سے زیادہ اوقات تلاوتِ قرآن کریم میں گزارتے تھے۔ وہ دن میں بھی اس کی تلاوت کرتے تھے اور رات میں بھی۔ گھر میں بھی تلاوتِ قرآن میں مصروف رہتے اور مسجد میں بھی۔ (۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو مختلف صحابہؓ کو اپنے اپنے انداز سے تلاوتِ قرآن مجید کرتے ہوئے پایا۔ آپؐ نے فرمایا:

((اِقْرَءُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ، وَسَيَجِيْئُ اَقْوَامٌ يُقِيْمُوْنَهُ، كَمَا يُقَامُ الْقِدْحُ، يَتَعَجَّلُوْنَهُ وَلَا يَتَاَجَّلُوْنَهُ)) (۲۳)

''پڑھتے جاؤ' سب کا طرز اچھا ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی آئیں گے جو قرآن کو تیر کی طرح سیدھا کریں گے لیکن ان کا مقصد دنیا ہوگی' آخرت نہ ہوگی۔''

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كِتَابُ اللّٰهِ وَاحِدٌ، وَمِنْكُمُ الاحمرُ وَمِنكُمُ الاَبْيَضُ، وَمِنكُمُ الاَسْوَدُ)) (۲۴)

''اللہ کا شکر ہے اُس کی کتاب ایک ہے لیکن تم میں سرخ' سفید اور سیاہ قسم کے لوگ ہیں۔''

ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مسجد میں قرآن کی گونج سنی تو فرمایا: ''یہ لوگ قابلِ مبارک باد ہیں۔ ایسے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھے۔'' (۲۵)

سخت مصیبت اور پریشانی کے عالم میں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس شوق میں کوئی کمی نہ آتی تھی اور قرآن ان کے لیے تسکین اور طمانیت کا باعث بنتا تھا۔ روایت میں ہے کہ جس وقت بلوائیوں نے خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملہ کیا' وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھے اور اسی حالت میں ان کی شہادت ہوئی۔ (۲۶)

تلاوتِ قرآن مجید کا ایک ادب یہ ہے کہ مصحف کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ ترتیب کی رعایت کے بغیر اِدھر اُدھر سے پڑھ لینا یا الٹی ترتیب سے پڑھنا مناسب نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا: ''فلاں شخص قرآن مجید کو الٹی ترتیب سے پڑھتا ہے۔'' انہوں نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ذٰلِكَ مَنْكُوسُ الْقَلْبِ ''وہ دل کا اندھا ہے۔'' (۲۷)

قرآن کی تلاوت کرتے وقت سنجیدگی' انہماک اور توجہ نہایت ضروری ہے۔ دورانِ تلاوت اِدھر اُدھر دیکھنا' کوئی دوسرا کام کرنے لگنا' کسی سے بات چیت شروع کر دینا موزوں نہیں ہے۔ اس سے غیر دلچسپی اور غیر سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ قرآن مجید کے ساتھ ہمارے تعلق کے اعتبار سے مناسب رویہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آتا ہے کہ وہ قرآن کی تلاوت شروع کرتے تھے تو جب تک اس سے فارغ نہ ہو جاتے' کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ (۲۸)

قرآن کی تلاوت خود کرنے کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی دوسرے سے اسے سنا جائے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے معمولات میں سے تھا۔ بہت مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ مجھے قرآن مجید سناؤ۔ انہوں نے حیرت سے عرض کیا: آپؐ کو قرآن سناؤں' جب کہ وہ تو آپؐ ہی پر اُترا ہے! آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' میں اسے دوسرے سے سننا چاہتا ہوں۔'' حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: میں نے سورۃ النساء ابتدا سے پڑھنی شروع کی' یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: ''بس' رُک جاؤ!'' وہ آیت یہ ہے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾

''پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔''

میں آپؐ کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔ (۲۹)

آج کے دور میں قراءتِ قرآن کی ریکارڈنگ سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے مشہور قُرّاء کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ اسے ٹیپ ریکارڈر' کمپیوٹر' لیپ ٹاپ' موبائل اور دوسرے آلات کی مدد سے سنا جا سکتا ہے۔

حواشی

(۱) سنن ابی داؤد' ابواب شہر رمضان' باب تخریب القرآن' ۱۳۹۳

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب شہر رمضان' باب فی کم یقرأ القرآن' ۱۳۸۸' صحیح البخاری: ۵۰۵۴' ۵۰۵۴' صحیح مسلم: ۱۱۵۹

(۳) بخاری، مسلم، ابوداؤد، حوالہ بالا

(۴) النووی، ابوزکریا یحیی بن شرف، التبیان فی آداب حملۃ القرآن، تحقیق و ترویج: عبدالقادر الارنووط، دمشق، ص: ۴۹-۴۶

(۵) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب استحباب الترتیل فی القراءۃ، کتاب قیام اللیل، باب ذکر صلاۃ الرسول ﷺ باللیل، ۱۲۲۹، مسند احمد، ۳۰۰/۴/۲۹۴

(۶) النووی رحمہ اللہ، التبیان، ص ۷۰

(۷) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب الترتیل فی القراءۃ، ۵۰۴۳، صحیح مسلم: ۸۲۲

(۸) صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب ترتیل القراءۃ واجتناب الھذ: ۲۲۸

(۹) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، ۱۴۶۸، سنن النسائی: ۱۰۱۵، سنن ابن ماجہ: ۱۳۴۲

(۱۰) سنن ابی داؤد: ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، سنن ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلاۃ، باب فی حسن الصوت بالقرآن، ۱۳۳۷، مسند احمد، ۱۷۲/۱

(۱۱) ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار المعرفۃ بیروت، ۳۴۵/۱۔ ۳۴۴

(۱۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، باب فی حسن الصوت بالقرآن، ۱۳۴۱

(۱۳) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن، ۵۰۴۸، صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن، ۷۹۳

(۱۴) ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، دار المعرفۃ بیروت، ۲۰۰۴ء، ۱۱۱۲/۲، تذکرہ حضرت عبداللہ بن قیس ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

(۱۵) صحیح البخاری: ۴۲۳۲، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل الاشعریین، ۲۴۹۹

(۱۶) ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ج ۴، ص ۲۱۳

(۱۷) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۴ء، تذکرہ ابی موسیٰ الاشعری، ۱۱/۲

(۱۸) سنن ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، باب حسن الصوت بالقرآن، ۱۳۳۷

(۱۹) ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۶۸/۱

(۲۰) سنن النسائی: ۱۰۱۰، سنن ابن ماجہ: ۱۳۵۰

(۲۱) النووی رحمہ اللہ، التبیان، ص: ۸۷

(۲۲) صحیح البخاری: ۵۰۱۱، ۵۰۱۸، ۵۰۳۷، ۵۰۳۸۔

(۲۳) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب مایجزئ الأمی والأعجمی من القراءۃ، ۸۳۰

(۲۴) سنن ابی داؤد، حوالہ بالا، ۱۳۸

(۲۵) النووی رحمہ اللہ، التبیان، ص: ۸۶

(۲۶) ابن عبدالبر، الاستیصاب فی معرفۃ الاصحاب، تذکرہ عثمان بن عفان، ۸۷/۳

(۲۷) النووی رحمہ اللہ، التبیان، ص ۹۹

(۲۸) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، ۴۵۲۶

(۲۹) بخاری: ۴۵۸۲، مسلم: ۸۰۰، ابوداؤد: ۳۶۶۸، ترمذی: ۳۰۲۴، ۳۰۲۵

❁❁❁

بقیہ: عرضِ احوال

عوام کو اپنے قریب کرنے کے لیے اُن کی بات بھی سنیں۔ ''پپکا'' جیسے قوانین کا سہارا لے کر عارضی اقتدار تو حاصل کیا جاسکتا ہے مگر دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہونے، باطل قوتوں کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے اور مسجدِ اقصیٰ کی حرمت کے لیے حقیقی اور عملی اقدامات درکار ہیں۔ لہٰذا خلوصِ دل سے مسجد اقصیٰ کی حرمت کی بحالی کے لیے جِدّوجُہد کریں۔

مسلمانانِ عالَم اِس وقت رمضان المبارک کی برکتیں سمیٹنے میں مصروف ہو چکے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دن کے روزے اور رات کے قیام سے خوب فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اُمّتِ مُسلمہ کو ہر نوع کی خیر و برکت عطا فرمائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے کہ مسلم اُمّہ کی اصل ضرورت کیا ہے۔ مسلمان جہاں جہاں بھی مشکل میں ہیں، وہ اُن کی غیب سے مدد فرمائے اور خصوصاً مسلمانانِ فلسطین کی خصوصی نصرت فرمائے۔ مسجدِ اقصیٰ کی حرمت کے لیے مسلمان ممالک کو متحد ہو کر عملی اقدامات کی توفیق عطا فرمائے اور باطل قوتوں کو نیست و نابود فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

رمضان المبارک

نیکیوں کی نشوونما کا موسم بہار

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

رمضان المبارک اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے۔ یہ مہینہ امتیازی شان رکھتا ہے' کیونکہ اس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث میں اس ماہِ مبارک کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ رمضان حصولِ ثواب کے لیے سازگار ماحول مہیا کرتا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا کہ وہ رمضان کے استقبال کی خصوصی تیاری کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اس مہینہ کے روزے رکھنے کا حکم ہے اور روزہ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آغازِ رمضان سے ایک روز قبل رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں تفصیل کے ساتھ ماہِ رمضان کا تعارف کرایا اور شب و روز کے معمول بتائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا۔ مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ أَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ ، وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ، وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ، وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ ۔ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوْبِهِ وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ، وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْتَقَصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ))

قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ

شَرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ، وَمَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ، وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهِ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ))

(رواه البیھقی فی شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الصوم)

''لوگو! تمہارے اوپر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ یہ برکت والا مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے روزے فرض قرار دیے ہیں اور اس کی رات کی عبادت نفل قرار دی ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی سے اللہ تعالیٰ کی قربت تلاش کرے (یعنی رب تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نفل عبادت کرے) اس کا ثواب اتنا ہی ہوتا ہے جتنا رمضان کے سوا دوسرے مہینوں میں فرض کا۔ اور جو شخص اس مہینہ میں فرض ادا کرے اس کو غیر رمضان میں ادا کیے ہوئے فرض سے ستر گنا ثواب ملتا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ غم خواری کا مہینہ ہے۔ اس میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے وہ اس کے لیے گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے اور دوزخ کی آگ سے نجات کا ذریعہ۔ اور اس کو بھی روزہ دار کے برابر ثواب ملتا ہے جبکہ روزہ دار کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں ہوتی''۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم سب کے پاس اتنا سامان نہیں ہے کہ اس سے ہم روزہ داروں کے روزے افطار کرائیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرماتا ہے جو لسی کے ایک گھونٹ' ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے کسی کا روزہ افطار کرائے' اور جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے اس کو اللہ تعالیٰ (روزِ قیامت) میرے حوض سے ایسا سیراب کرے گا کہ پھر اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی حتیٰ کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور یہ مہینہ ایک ایسا مہینہ ہے کہ اس کے ابتدا میں رحمت ہے' درمیان میں مغفرت اور آخر میں دوزخ سے نجات۔ اور جس شخص نے اس مہینہ میں اپنے (روزہ دار) غلام پر کام کا بوجھ ہلکا کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے اور اسے دوزخ کی آگ سے نجات دیتا ہے۔''

اس حدیث سے رمضان المبارک کا پروگرام واضح طور پر سمجھ میں آ رہا ہے کہ مسلمان دن کو روزہ رکھیں' یعنی رضائے الٰہی کی خاطر بھوک اور پیاس برداشت کریں' اور رات کو قیام کریں'

یعنی اجتماعی طور پر قرآن کی تلاوت اور سماعت کا اہتمام کریں جسے عرفِ عام میں نمازِ تراویح کہا جاتا ہے۔ چونکہ ان ایام میں تھوڑی عبادت کا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لیے رمضان المبارک میں مساجد کی رونق بڑھ جاتی ہے‘ لوگ بکثرت نوافل پڑھتے اور تلاوت کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ، فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ [وَفِیْ رِوَایَةٍ : فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ] وَاُغْلِقَتْ اَبْوَابُ جَهَنَّمَ، وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ)) وَفِیْ اُخْرٰی: ((فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ)) (متفق علیه)

’’جب رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے [ایک دوسری روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے] کھول دیے جاتے ہیں‘ اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں‘ اور شیطانوں کو زنجیریں پہنا دی جاتی ہیں‘‘۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ’’رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔‘‘

اس طرح رمضان المبارک میں ربّ العزت کی طرف سے نیکی کمانے کے لیے سازگار ماحول میسّر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے کہ سازگار ماحول کی فراہمی کے باوجود جو لوگ رمضان میں اپنے شب و روز کے معمولات تبدیل نہیں کرتے اور بدستور بُرائی پر عمل پیرا رہتے ہیں‘ وہ انتہائی ناپسندیدہ قرار پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے سزاوار بنتے ہیں‘ کیونکہ جو لوگ سرکش شیطانوں کے قید کر دیے جانے کے باوجود بھی گناہ کرتے ہیں گویا کہ وہ اپنی ذات کو گناہوں کا اس حد تک خوگر بنا چکے ہوتے ہیں کہ اب انہیں کسی بیرونی تحریص و ترغیب کی ضرورت نہیں رہتی‘ بلکہ ان کے باطن میں شیطان نے ہمہ وقتی بسیرا کر رکھا ہے۔

رمضان کا مہینہ باطنی صفائی کے لیے تربیت فراہم کرتا ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو اِس ماہِ مبارک کے ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دن کو پورے آداب کے ساتھ روزہ رکھتے اور شب کو دل کی آمادگی کے ساتھ نمازِ تراویح اور فہمِ قرآن کی مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ روزے کی حالت میں جہاں کھانے پینے کی پاکیزہ‘ طیب اور حلال چیزیں نہیں کھاتے وہاں مکروہات‘ ممنوعات اور منکرات کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ جھوٹ اور غیبت سے بچتے اور برائیوں سے دُور رہتے ہیں۔ اس طرح ایک ماہ کی تربیت انہیں واقعی گناہوں سے متنفّر

اور نیکیوں سے مانوس کر دیتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کئی لوگوں نے رمضان المبارک کے بابرکت اور سازگار ماحول سے فائدہ اٹھایا اور منشیات کے استعمال جیسی بُری عادات کو ترک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بعض ناپختہ فہم لوگ رمضان المبارک کے پروگرام کی حکمت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس ماہِ مبارک سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ تو ضرور رکھتے ہیں لیکن برائیوں کے ارتکاب سے پرہیز اُن کے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ)) (صحیح البخاری)

’’جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور بُرا کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔‘‘

گویا رمضان المبارک میں بھوکا پیاسا رہنا اور رات کا قیام حصولِ مقصد کے لیے واسطہ ہے اور اصل مقصد تقویٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة)

’’اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا‘ تاکہ تم پرہیزگار بنو۔‘‘

پس روزہ وہی مفید ہے جو انسان کے معمولات پر اثر انداز ہو کر اسے پرہیزگار بنا دے۔ بالفاظِ دیگر اسے بھلائیاں مرغوب ہو جائیں اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو جائے۔ فہو المطلوب!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

رمضان کیسے گزاریں!

خورشید انجم ☆

الحمد للہ‘ رمضان کا مبارک مہینہ سایہ فگن ہے۔ معلوم نہیں کہ اگلے سال یہ بابرکت موقع ہمیں نصیب ہوتا بھی ہے یا نہیں‘ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس ماہِ مبارک کی برکتوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔

رمضان المبارک کی عبادات ایک ایسا سلسلہ ریاضت ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انسان نفس اور شیطان سے محفوظ رہتا ہے۔ انسان کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسے تقویٰ کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور نتیجتاً آئندہ کی زندگی سنور جاتی ہے۔ البتہ یہ تبھی ممکن ہے جب رمضان کو اس کی حقیقی روح کے مطابق بسر کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

’’جس نے رمضان بھر کے روزے رکھے‘ اس کی حدود کو پہچانا اور جن چیزوں سے بچنا تھا ان سے بچا‘ تو اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔‘‘ (ابن حبان)

رمضان میں ان امور سے بچا جائے

آپ سے گزارش ہے کہ درج ذیل امور سے اجتناب کیجیے‘ کیونکہ یہ رمضان کی برکات کو ضائع کرنے والے ہیں:

(i) جھوٹ‘ غیبت اور چغلی وغیرہ: حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ)) (صحيح البخاري)

’’جس نے (روزے میں) جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو کوئی حاجت

☆ مرکزی ناظم تعلیم وتربیت‘ تنظیم اسلامی

نہیں کہ یہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔‘‘

(ii) دوسروں سے جھگڑنا: رمضان المبارک صبر کا مہینہ ہے۔ جہاں ہمیں کھانے پینے پر صبر کرنا ہے‘ وہیں اپنے مزاج پر بھی صبر کرنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((إِذَا أَصْبَحَ أَحَدُكُمْ يَوْمًا صَائِمًا، فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَجْهَلْ، فَإِنِ امْرُؤٌ شَاتَمَهُ أَوْ قَاتَلَهُ، فَلْيَقُلْ: إِنِّي صَائِمٌ)) (صحيح مسلم)

’’جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ تو فحش گوئی کرے اور نہ ہی شور وغل مچائے۔ اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کی کوشش کرے تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔‘‘

(iii) سحر وافطار میں اسراف: رمضان المبارک میں زیادہ کھانے پینے سے انسان اس کی برکات سے محروم رہتا ہے۔ رمضان تو کم کھانے کا مہینہ ہے تاکہ انسان کا نفس کمزور ہو کر اس کا مطیع ہو جائے۔

(iv) لغویات سے لطف اندوز ہونا: حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ روزہ صرف اسی کا نام نہیں کہ انسان کھانے پینے سے رُکا رہے بلکہ یہ جھوٹ‘ فضول اور لغو (لایعنی) کاموں سے بھی بچنے کا نام ہے۔ افسوس کہ ہم ’’روزہ بہلانے یا گزارنے‘‘ کے لیے بہت سارے لغو کاموں مثلاً لڈو‘ کیرم بورڈ‘ تاش وغیرہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے روزہ کی توہین ہے۔

(v) بے پردگی اور بدنظری: قرآن مجید میں نظروں کو جھکا کر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر روزہ رکھ کر انسان اپنی نگاہ کی حفاظت نہ کرے تو یہ عمل اسے اجر وثواب سے محروم کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بدنظری کرنے والے پر اور اس عورت پر جو اپنے آپ کو بدنظری کے لیے پیش کرے‘ دونوں پر اللہ کی لعنت کی ہے۔

رمضان میں کرنے والے کام

ماقبل اُن امور کا تذکرہ کیا گیا جن سے رمضان المبارک میں بچنا چاہیے‘ اب ذیل میں اُن امور کا بیان ہے جن کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ رمضان المبارک کی زیادہ سے زیادہ برکات حاصل ہو سکیں۔

(i) قرآن حکیم سے تعلق قائم کرنا: رمضان المبارک میں کم از کم ایک مرتبہ مکمل قرآن مجید کی تلاوت ضرور کیجیے۔ مزید برآں قرآن حکیم کے معنی ومفاہیم سے آگاہی کے لیے ترجمہ وتفسیر کا

مطالعہ بھی کریں۔ درس اور دورۂ ترجمہ قرآن کی محفلوں میں شرکت کریں۔ بفحوائے حدیثِ نبوی ﷺ رمضان کی راتوں میں قرآن کے ساتھ جاگنے والے کے حق میں قرآن سفارش کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی سفارش قبول فرمائیں گے۔ فرمانِ نبویؐ ملاحظہ ہو:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ، يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ إِنِّي مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، فَيُشَفَّعَانِ))(رواه البيهقی فی شعب الايمان)

''روزہ اور قرآن بندے کے لیے سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے رب! میں نے دن کے وقت اسے کھانے پینے اور خواہشات سے روکے رکھا' اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! اور قرآن عرض کرے گا: میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا' اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ پس ان دونوں کی سفارش قبول کی جائے گی۔''

(ii) **حصولِ مغفرت کی سعی وجدّوجہد:** حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ أَنْ يُغْفَرَ لَهُ، وَرَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ أَدْرَكَ عِنْدَهُ أَبَوَاهُ الْكِبَرَ فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ))(سنن الترمذی)

''اس شخص کی ناک خاک آلود ہو (یعنی وہ شخص برباد ہو جائے) جو رمضان کا مہینہ تو پائے مگر اس کی مغفرت ہوئے بغیر وہ مہینہ گزر جائے۔ اور اس شخص کی بھی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے میں پایا ہو اور وہ دونوں اسے (ان کے ساتھ حسنِ سلوک نہ کرنے کی وجہ سے) جنت کا مستحق نہ بنا سکے ہوں۔''

لہٰذا اس ماہ میں خاص طور پر خود اپنے لیے' اپنے والدین' اپنے اہل وعیال' اعزّہ واقارب' رفقاء اور تمام مؤمنین کے لیے زیادہ سے زیادہ مغفرت کی دعا کریں۔

(iii) **اللہ کی راہ میں خرچ کرنا:** اِنفاق فی سبیل اللہ حصولِ تقویٰ وتزکیۂ نفس کا خصوصی ذریعہ ہے اور رمضان میں اس کا اجر بھی کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

(iv) **روزہ افطار کرانا:** حدیث میں روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار کے اجر کے برابر کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہاں تک فرمایا گیا کہ یہ اجر وہ شخص بھی پا سکتا ہے جو لسّی یا پانی کے ایک گھونٹ پر بھی کسی کو روزہ افطار کرا دے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِمْ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا)) (سنن ابن ماجه)

''جو کوئی کسی روزہ دار کو افطار کرا دے تو اس کو روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا اور روزہ دار کے ثواب میں سے کوئی کمی بھی نہیں ہوگی۔''

(v) **اعتکاف:** رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف نبی اکرم ﷺ کی مستقل سُنّت ہے۔ آپ ﷺ ایک سال اعتکاف نہ کر سکے تو اگلے سال دو عشروں کا اعتکاف فرمایا۔ اعتکاف میں شبِ قدر کی بھی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔

(vi) **لیلۃ القدر کی تلاش:** نبی اکرم ﷺ کا حکم ہے کہ ''شبِ قدر کو آخری عشرے میں تلاش کرو''۔ دیگر روایات میں آخری عشرے کی طاق راتوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کی تاکید ہے۔

(vii) **تراویح اور تہجد:** انسان دن کو روزہ رکھ کر اپنے نفس کو کمزور اور رات کو قرآن سن کر اپنی روح کو طاقتور بناتا ہے۔ یہ عمل انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ رمضان میں نوافل کا اجر فرض کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا تراویح' تہجد اور دیگر نوافل کا ضرور اہتمام کیجیے۔

(viii) **اخلاصِ نیت:** ہر کام اللہ کی رضا اور آخرت کی نجات کے لیے سرانجام دیجیے۔ اپنی نیت کو مسلسل ٹٹولتے رہیے کہ کہیں اس عمل میں دکھاوا تو شامل نہیں ہو گیا۔

محترم رفقاء! رمضان المبارک مغفرت ومعافی اور روحانی ترقی کا مہینہ ہے۔ رمضان کے بعد والی ہماری زندگی رمضان سے پہلی والی زندگی سے مختلف ہونی چاہیے۔ ہمیں خود محسوس ہو کہ ہمارے اندر رمضان کے بعد تبدیلی آئی ہے۔ ہم ارکانِ اسلام کی پابندی' حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام اور حلال وحرام میں تمیز پہلے سے زیادہ کرنے لگے ہیں۔ دعوت وتبلیغ' اقامتِ دین کی جدّوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ میں پہلے سے زیادہ وقت دینا شروع کر دیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اُس نے کسی درجے میں ہمیں رمضان کی برکات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔

رمضان المبارک میں اپنے نظمِ زیریں اور نظمِ بالا کو بھی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت پر استقامت عطا فرمائے اور ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین!

❁❁❁

روزے کے روحانی وطبّی فوائد

احمد علی محمودی

روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ اس میں مسلمان طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک کھانے‘ پینے اور نفسانی خواہشات سے پرہیز کرتے ہیں۔ روزے کا مقصد تقویٰ‘ صبر اور اللہ تعالیٰ کی رضا وقربت حاصل کرنا ہے۔ یہ ایک اہم عبادت اور بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ اسلام میں روزہ کو جسمانی‘ روحانی اور ذہنی صحت کے لیے اہم قرار دیا گیا ہے۔ روزے کے ذریعے ایک مسلمان اپنی روحانی وجسمانی حالت کو بہتر بنا سکتا ہے۔

روزے کے روحانی فوائد

روزے مسلمان کے دل و دماغ کو پاکیزہ بنانے‘ اللہ سے قربت بڑھانے‘ دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے میں مددفراہم کرتے ہیں۔ چند اہم روحانی فوائد درج ذیل ہیں:

(۱) تقویٰ میں اضافہ: تقویٰ کا حصول ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے‘ کیونکہ یہ ایمان کی روح اور اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ تقویٰ ایک مسلسل عمل ہے‘ جس کے لیے مستقل مزاجی اور خلوصِ نیت کی ضرورت ہے۔ روزہ ایک مسلمان کو اپنی خواہشات قابو میں رکھنے کی تربیت دیتا ہے اور یوں دل میں تقویٰ کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۸۳﴾ (البقرۃ)

”اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔“

(۲) صبر اور برداشت: یہ خصوصیات ایک مسلمان کی طاقت ہیں‘ جو مشکلات اور آزمائشوں میں اُسے حوصلہ دیتی اور مضبوط بناتی ہیں۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ آزمائشوں کو اللہ کی رضا کے لیے قبول کریں اور اپنے اخلاق کو بلند کریں۔ یہ دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہیں‘ جن کا

ذکر قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں بار بار آیا ہے۔ صبر سے دل کو سکون ملتا ہے۔ صبر کرنے والے اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا اور خواہشات پر قابو پانا‘ صبر کے اعلیٰ درجے کی مثال ہے۔ روزہ رکھنے سے صبر کرنے کی عادت پروان چڑھتی ہے۔

(۳) شکرگزاری: شکرگزاری کا جذبہ مسلمان کے دل اور روح کو سکون فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو نہ صرف اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرتا ہے بلکہ انسان کو عاجزی‘ قناعت اور خوشی کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔ شکرگزاری زندگی میں موجود چھوٹی بڑی ہر نعمت کو محسوس کرنے اور اُس کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے۔ جو لوگ شکرگزار ہوتے ہیں‘ وہ اپنی موجودہ حالت میں خوش رہتے ہیں اور اس طرح حسد و ناشکری سے بچتے ہیں۔ شکرگزاری مسلمان کو اللہ ربّ العزت سے قریب کرتی ہے‘ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں مزید بڑھتی ہیں۔ شکرگزاری نہ صرف ایک عبادت ہے بلکہ یہ زندگی گزارنے کا بہترین انداز بھی ہے۔ روزے کے دوران بھوک اور پیاس کا سامنا کرنے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر محسوس ہوتی ہے‘ اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بن جاتا ہے۔

(۴) قُربِ الٰہی کا ذریعہ: اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز کرلیں اور اُس کے احکامات پر عمل کریں۔ زندگی کے ہر پہلو میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھیں۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں‘ جن میں سے ایک روزہ بھی ہے۔ روزہ صرف اللہ کے لیے رکھا جاتا ہے۔ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((اَلصَّوْمُ لِي وَاَنَا اَجْزِي بِهِ)) (جامع الترمذی، ح ۷۶۴)

”روزہ میرے لیے ہے اور مَیں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔“

(۵) گناہوں کی معافی: روزہ صرف بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں‘ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کے حصول کا عظیم ذریعہ ہے۔ روزے کے دوران گناہوں پر ندامت سے رجوع الی اللہ کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ)) (متفق علیہ)

”جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے‘ اس کے

پچھلے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

((الصِّيَامُ جُنَّةٌ))(متفق عليه)

''روزہ ڈھال ہے (جو انسان کو گناہوں اور جہنم کی آگ سے بچاتا ہے)۔''

اللہ تعالیٰ روزے کی برکت سے نہ صرف بندے کے گناہوں کو معاف فرماتے بلکہ جنت میں بلند مقام بھی عطا فرماتے ہیں۔

(۶) روزہ اور قرآن کی شفاعت: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ : اَيْ رَبِّ اِنِّيْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ، وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ : مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ، فَيُشَفَّعَانِ)) (رواه احمد والطبرانی والبیهقی)

''روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کے لیے شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: اے میرے ربّ! مَیں نے اس شخص کو دن میں کھانے اور خواہشات سے روکے رکھا' پس میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: مَیں نے اسے راتوں کو نیند سے روکے رکھا' پس میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ تو دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

اس حدیث کے اہم نکات:

(i) روزہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا پسندیدہ عمل ہے کہ وہ قیامت کے دن اللہ کے حضور سفارش کرے گا۔

(ii) جو لوگ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں' خاص طور پر رات کے اوقات میں' قرآن اُن کے حق میں شفاعت کرے گا۔

(iii) جو شخص دنیا میں صبر کے ساتھ اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے' قیامت کے دن اُسے بہترین اجر ملے گا۔

ہمیں چاہیے کہ روزے کے دوران قرآن سے بھی اپنا تعلق مضبوط کریں' تاکہ روزِ قیامت ہمیں ان دونوں کی شفاعت حاصل ہو سکے۔

(۷) تزکیۂ نفس: تزکیۂ نفس کا مطلب ہے نفس کی پاکیزگی اور روحانی اصلاح۔ روزے سے تزکیۂ نفس حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے مسلمان اپنے اخلاق' عادات اور کردار کو بہتر بناتا ہے تاکہ اللہ کے قریب ہو سکے اور دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرے۔ اللہ پر کامل ایمان اور بھروسا تزکیۂ نفس کی بنیاد ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ (الشمس)

''کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ اور ناکام ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کر لیا۔''

تزکیۂ نفس سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ زندگی میں برکت اور آسانی آتی ہے۔ گناہوں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔

(۸) روحانی سکون: روزہ نہ صرف ایک عبادت ہے بلکہ یہ انسان کی روحانی اور جسمانی زندگی پر بھی گہرے اثرات مرتّب کرتا ہے۔ روزے کے دوران عبادات' ذکر و اذکار اور قرآن کی تلاوت سے دل کو سکون ملتا ہے۔ روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں بلکہ اپنی خواہشات' زبان اور عمل کو کنٹرول کرنا بھی ہے۔ یہ عمل روحانی سکون اور اللہ کے قریب ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ دنیاوی خواہشات کو کنٹرول کر کے انسان اپنی روحانی کیفیت کو بہتر بناتا ہے۔ روزہ انسان کو گناہوں سے دور رکھتا ہے اور اس کے دل کو نرم و پاکیزہ بناتا ہے۔ یہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے اور یہ یقین مسلمان کو اندرونی سکون فراہم کرتا ہے۔ روزے کے دوران بھوک کا تجربہ دوسروں کے دکھ درد سمجھنے کا موقع مہیا کرتا ہے۔ صبح سحری اور شام افطاری کا نظم زندگی میں ڈسپلن پیدا کرتا ہے جو روحانی سکون کا ذریعہ بنتا ہے۔

(۹) بھائی چارا اور ہمدردی: روزہ ہمیں بھائی چارے' ہمدردی اور انسانیت کے عظیم اصولوں کی عملی تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔ روزے کی حالت میں تمام مسلمان یکساں طور پر ایک جیسے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ کوئی امیر ہو یا غریب' سب ایک وقت پر کھاتے اور ایک وقت پر عبادت کرتے ہیں۔ یہ عمل برابری اور اتحاد کا درس دیتا ہے جو معاشرتی بھائی چارے کو مضبوط کرتا ہے۔ مساجد اور اجتماعی افطاریوں کے ذریعے مختلف طبقات کے افراد آپس میں جڑتے ہیں اور یوں معاشرتی محبت اور تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزہ دل کو نرم کرنے اور ضرورت مندوں کی

مدد کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ صدقہ و خیرات اور افطاری کے انتظامات اس ہمدردی کا عملی اظہار ہیں۔ روزہ رکھنے سے مسلمان کو بھوک اور پیاس کا حقیقی احساس ہوتا ہے۔ یہ تجربہ اُن لوگوں کے دکھ درد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو غربت اور تنگ دستی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ روزہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنی ذات سے بڑھ کر دوسروں کا خیال رکھیں، معاشرے میں محبت اور بھائی چارے کو فروغ دیں، ضرورت مندوں کی مدد کریں۔ یہ وہ تربیت ہے جو نہ صرف ہمیں انفرادی طور پر ایک بہتر انسان بناتی ہے بلکہ اجتماعی طور پر بھی ایک مثالی معاشرہ بنانے میں مدد دیتی ہے۔

(۱۰) اللہ کی رضا حاصل کرنا: روزے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا اور اُس کے قریب ہونا ہے۔ روزہ صرف اللہ کے لیے رکھا جائے، اس میں ریاکاری یا دکھاوا شامل نہ ہو۔ نیت خالص ہو تو عمل مقبول ہوتا ہے۔ روزہ اللہ سے محبت کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر اسے اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے رکھا جائے اور شریعت کے مطابق اس کے تقاضے پورے کیے جائیں تو یہ انسان کے دل کے سکون اور آخرت میں اس کی کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔

روزے کے طبّی فوائد

روزہ جسمانی صحت کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ اس کا انسانی صحت پر مثبت اثر ثابت ہو چکا ہے۔ جدید طبی تحقیق نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

(۱) نظامِ انہضام میں بہتری: معدے کا نظام ایک ایسا نفیس network ہے جو غذائی اجزاء کو ہضم اور جذب کرنے اور جسم سے فضلہ کے اخراج کا ذمہ دار ہے۔ روزہ رکھنے سے نظامِ انہضام (digestive system) کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ عام دنوں میں وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ کھانا معدے کو مسلسل کام پر مجبور رکھتا ہے، جبکہ روزہ رکھنے سے معدہ اور آنتوں کو آرام ملتا ہے۔ اس سے ہاضمے کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔ روزے سے تیزابیت اور بدہضمی وغیرہ سے شفایابی حاصل ہوتی ہے۔

(۲) وزن میں کمی: روزے سے وزن میں کمی ایک قدرتی عمل ہے، کیونکہ کھانے پینے کے اوقات مخصوص ہوتے ہیں۔ تاہم اس کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ آپ افطار کے بعد کیا کچھ کھاتے ہیں اور اپنا طرزِ زندگی کیسا رکھتے ہیں۔ یہاں کچھ نکات دیے جا رہے ہیں جو روزے کے ذریعے وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں:

(i) سحری میں کاربوہائیڈریٹس (جیسے دلیہ، گندم کی روٹی، یا چاول) اور پروٹین (جیسے انڈے، دہی، یا دالیں) شامل کریں۔ زیادہ چکنائی یا میٹھا کھانے سے پرہیز کریں تاکہ جسم کو دن بھر توانائی ملے اور بھوک کم محسوس ہو۔

(ii) افطار کے وقت زیادہ کھانے سے گریز کریں۔ کھجور کے ساتھ افطار کریں اور پانی یا سکنجبین پئیں۔ تلی ہوئی اور چکنائی والی چیزوں کی بجائے ہلکی اور غذائیت سے بھرپور غذا (جیسے پھل، سبزیاں، یا شوربے والے کھانے) کا انتخاب کریں۔

(iii) افطار اور سحری کے درمیان زیادہ سے زیادہ پانی پینے کی کوشش کریں تاکہ جسم میں اس کی کمی نہ ہو۔

(iv) تراویح یا ہلکی پھلکی واک وزن کم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ افطار کے ایک دو گھنٹے بعد ہلکی ورزش کریں۔

(v) روزے کھولنے کے بعد میٹھی اشیاء کھانے سے پرہیز کریں یا ان کی مقدار کم کریں، کیونکہ یہ وزن بڑھاتی ہیں۔

(۳) زہریلے مادوں کا اخراج: روزہ رکھنے کے دوران جسم کو زہریلے مادوں (toxins) سے پاک کرنے میں مدد ملتی ہے، جسے Detoxification کہا جاتا ہے۔

(i) روزے کے دوران کھانے اور پینے سے گریز کیا جاتا ہے، جس سے جسم کے نظامِ انہضام کو آرام ملتا ہے اور وہ اپنی توانائی جسم سے زہریلے مادوں کے خاتمے پر مرکوز کرتا ہے۔

(ii) جب جسم کو گلوکوز کی فراہمی رکتی ہے تو وہ چربی کو توانائی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس عمل کے دوران چربی کے ذخائر میں موجود زہریلے مادے خارج ہوتے ہیں۔

(iii) روزے کے دوران جگر اور گردے، جو قدرتی طور پر زہریلے مادوں کو نکالنے کا کام کرتے ہیں، زیادہ مؤثر طریقے سے کام کرنے لگتے ہیں۔

(۴) بلڈ شوگر اور کولیسٹرول کی سطح میں توازن: روزہ بلڈ شوگر اور کولیسٹرول لیول کنٹرول کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس دوران جسم انسولین کے استعمال کو بہتر بناتا ہے، جو ذیابیطس کے مریضوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ روزہ رکھنے سے خراب کولیسٹرول کم جبکہ اچھا کولیسٹرول بڑھتا ہے۔

روزہ رکھنے سے انسولین کی حساسیت بڑھتی ہے‘ جس کے نتیجے میں جسم خون میں موجود گلوکوز کو زیادہ مؤثر طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ کھانے کے اوقات محدود ہونے کی وجہ سے بلڈ شوگر لیول قدرتی طور پر کم ہوتا ہے اور جسم توانائی کے لیے چربی کو جلانا شروع کر دیتا ہے۔ زیادہ چکنائی اور مٹھاس والی چیزوں سے پرہیز کرنے کے باعث بلڈ شوگر کی سطح مستحکم رہتی ہے۔

(۵) دماغی صحت میں بہتری: روزہ دماغی خلیوں کو متحرک اور دماغی امراض کے خطرے کو کم کرتا ہے۔ روزہ رکھنے سے صبر‘ سکون‘ اور اللہ پر توکّل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو ذہنی صحت پر مثبت اثر ڈالتا ہے۔ روزہ رکھنے سے دماغ کے مفید ہارمونز میں اضافہ ہوتا ہے‘ جو یادداشت کو بہتر بنانے اور ذہنی دباؤ کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

(۶) قوتِ مدافعت میں اضافہ: روزہ جسم کے مدافعتی نظام (immune system) کو مضبوط کرتا ہے‘ کیونکہ اس دوران سفید خلیات کی تشکیل میں اضافہ ہوتا ہے جو بیماریوں سے لڑنے میں مددگار ہیں۔

(۷) دل کی بیماریوں سے بچاؤ: دل کی بیماریوں سے بچاؤ میں روزہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ روزے کے دوران کولیسٹرول کی سطح کم ہوتی ہے اور اچھے کولیسٹرول کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے جس سے دل کی بیماریوں سے بچاؤ میں مدد فراہم ہوتی ہے۔ روزے سے خون کی روانی بہتر ہوتی ہے۔ روزہ رکھنے سے وزن کم ہوتا ہے‘ جو مٹاپے اور دل کی بیماریوں کے خطرے کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ بلڈ شوگر لیول کنٹرول میں رہنے سے ذیابیطس کی وجہ سے پیدا ہونے والی دل کی بیماریوں کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ روزے کے دوران دل کی دھڑکن نارمل اور مستحکم رہتی ہے۔

(۸) خلیات کی مرمت اور بڑھاپے کے اثرات میں کمی: روزے کے دوران جسم میں خودکار صفائی کا عمل شروع ہوتا ہے‘ جو خراب خلیات کی مرمت اور نئے خلیات کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ یہ عمل جسم کی مجموعی صحت کو بہتر بناتا ہے اور بیماریوں سے بچاؤ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جسم میں ایسے پروٹین اور enzymes متحرک ہوتے ہیں جو ڈی این اے کے نقصان کی مرمت کرتے ہیں‘ جس سے خلیات کی صحت بہتر ہوتی ہے۔ روزہ رکھنے سے جسم میں ان free radicals کی مقدار کم ہوتی ہے جو بڑھاپے کے عمل کو تیز کرتے ہیں۔ یہ عمل جلد کو تروتازہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ انسانی جسم میں growth hormones کی سطح بڑھتی ہے جو جلد کی مرمت اور جوانی کو برقرار رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

(۹) سوزش میں کمی: روزہ رکھنے سے جسم کے مدافعتی نظام پر مثبت اثر پڑتا ہے اور جسم میں موجود سوزش کے عوامل (inflammatory markers) کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ افطار اور سحری میں صحت مند غذا کا انتخاب کیا جائے۔ زیتون کا تیل بھی قدرتی سوزش کم کرتا ہے۔

(۱۰) بہتر نیند اور توانائی کا حصول: روزے کے دوران بہتر نیند اور توانائی کا حصول دن کو زیادہ مؤثر اور روحانی طور پر بھرپور بنا سکتا ہے۔ درج ذیل نکات پر عمل کر کے آپ روزے کے دوران اپنی نیند اور توانائی کو بہتر بنا سکتے ہیں:

(i) سحری میں پروٹین‘ کاربوہائیڈریٹس اور صحت مند چکنائی شامل کریں۔ نیز پانی کی مقدار زیادہ رکھیں۔

(ii) زیادہ بھاری کھانے سے گریز کریں اور افطار کو ہلکا اور غذائیت سے بھرپور رکھیں۔ بہت زیادہ چکنائی اور تلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کریں۔

(iii) رات کو جلد سونے کی عادت ڈالیں تاکہ سحری کے لیے تازہ دم ہوں۔ دن کے دوران تھوڑی دیر آرام (قیلولہ) کرنے سے توانائی بحال ہو سکتی ہے۔

(iv) افطار و سحر میں کاربونیٹڈ ڈرنکس کے استعمال سے صحت پر منفی اثرات مترتب ہو سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ان کی جگہ پانی‘ قدرتی جوس یا دیگر صحت بخش مشروبات کو ترجیح دی جائے۔ نیز caffeine مشروبات (چائے/کافی) کم مقدار میں لیں۔

(v) سخت جسمانی مشقت سے گریز کریں۔ ہلکی ورزش‘ مثلاً چہل قدمی یا stretching‘ افطار کے بعد کریں تاکہ جسمانی توانائی بحال ہو۔

(vi) اپنی دن بھر کی منصوبہ بندی اس طرح کریں کہ ضروری کاموں کو افطار اور سحری کے درمیانی اوقات میں انجام دیں۔

درج بالا تجاویز پر عمل کر کے آپ اپنے روزے کو زیادہ مؤثر اور توانائی بخش بنا سکتے ہیں۔

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

نفاذِ شریعت کے لیے طریقِ کار پر
ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور مفتی محمد تقی عثمانی کا اتفاق

انجینئر نوید احمد

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ۱۹۷۵ء میں تنظیمِ اسلامی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اِس فیصلہ سے قبل ۱۹۷۴ء میں ایک خطاب کے دوران اُنہوں نے اِس فیصلہ کا پس منظر بیان کیا۔ اُن کے نزدیک جماعتِ اسلامی کے قیام کا مقصد تو حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا' لیکن انتخابی سیاست میں آنے کی وجہ سے اب اُس کی اوّلین ترجیح جمہوریت کی بحالی بن چکی ہے۔ اپنے مذکورہ خطاب میں ڈاکٹر صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جاسکتی ہے' اُنہوں ☆ نے اپنے اُصولی موقف کو ترک کر کے' بغیر اس کے کہ کوئی علمی وفکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی وعملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو' نظامِ حکومت کی ''اصلاح'' کے لیے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی' البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک ''وَلٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ'' کے مصداق پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زورِ بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہوجائے گا' لہٰذا کمالِ شانِ استغناء کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراکِ عمل کی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ جب پنجاب کے ۱۹۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دُور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔

☆ مولانا مودودیؒ

پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اِس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا پہلا گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اُتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی ولادینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔ سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دورِ حکومت اِسی ''بحالیٔ جمہوریت'' کی مہم کی نذر ہوگیا۔ لیکن جب اُن کے اقتدار کی عمارت گری تو اُس کے ملبے سے کچھ ''اور'' ہی برآمد ہوگیا!

ہمارے پیشِ نظر اِس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہی ہے نہ جماعتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی' نہ ہم اِس وقت اِس بحث ہی میں الجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے اِس ''انقلابِ حال'' کے اسباب کیا تھے (اِس پر ہم اپنی تالیف ''تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' میں مفصّل بحث بھی کر چکے ہیں)۔ ہمیں اِس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اِس ''انتقالِ موقف'' سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں ٹھیٹھ اُصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر سے خالی ہوگئی اور اِس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تا حال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودی اور اُن کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہوکر پیدا کیا ہے۔''(۱)

اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''جماعتِ اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اُصولاً ۱۹۴۷ء ہی میں پیدا ہوگئی تھی' لیکن کم وبیش دس سال یہ اپنی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوا۔ لیکن ۵۶-۵۷ء میں جماعت میں اِس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلافِ رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجتاً جماعت کے ''اکابر'' کی اکثریت چند ''اصاغر'' سمیت جماعت سے کٹ گئی۔ اُن ''اصاغر'' میں سے ایک اِن سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں ''بڑے'' تو اپنے اپنے ''بڑے'' کاموں میں مشغول ومصروف ہوگئے' لیکن یہ ''چھوٹا'' ؎

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اِس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!

کے مصداق اپنے دل ودماغ کو اُس جنّتِ گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کر سکا' بلکہ جیسے جیسے دن بیتے اُس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ ؎

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ اُلفت اور محکم ہو گئی!

وہ جب جماعت سے علیحدہ ہوا‘ اُس کی عمر کُل پچیس برس تھی۔ بالکل نَوعمری کا عالم‘ نہ علم نہ تجربہ‘ لہٰذا پورے دس برس اُس نے اِس انتظار میں بسر کیے کہ ’’بڑوں‘‘ میں سے کوئی ہمت کرے اور از سرِ نو سفر کا آغاز کر دے۔ لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا‘ تا آنکہ ۶۶-۱۹۶۷ء میں اُس نے خود کمرِ ہمت کسی اور بفحوائے الفاظِ قرآنی ’’اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ‘‘ (’’یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اُس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے!‘‘) درسِ قرآن کی صورت میں ٹھیٹھ اسلامی دعوت کے لیے ذہنی و فکری سطح پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اُس کے کام کو اللہ نے شرفِ قبول عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اُس کے قائم کردہ ’’حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن‘‘ کی کوکھ سے ’’مرکزی انجمن خُدام القرآن لاہور‘‘ برآمد ہوگئی اور اب اُس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی ٹھیٹھ اُصولی اسلامی تحریک کے اِحیاء کے لیے ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے!

اُسے خوب معلوم ہے اُس کے پاس نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت و فطانت ہے‘ نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سی صلاحیتِ کار اور محنت و مشقت کا مادّہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحبِ طرز ادیب‘ بایں ہمہ ایک احساسِ فرض ہے جو چین نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساسِ گراں ہے جس نے اُسے ع ’’ہر چہ باداباد‘ ما کشتی در آب انداختیم‘‘ کے مصداق اِس پُرخطر وادی میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے!‘‘(۲)

ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ انتخابی سیاست میں دیگر جماعتوں کا حریف بن کر اسلام کے نفاذ کے مشن کو متنازعہ معاملہ (issue) بنا دیا جاتا ہے۔ پھر عملی جِدّوجُہد میں جمہوریت کو نفاذِ اسلام پر ترجیح دے دی جاتی ہے۔ نفاذِ اسلام کے لیے موجودہ حالات میں کامیابی کا امکان پُرامن احتجاجی جِدّوجُہد کے ذریعہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مذکورہ خطاب جولائی ۱۹۷۴ء میں کیا تھا۔ اِس کے دو ماہ بعد ستمبر ۱۹۷۴ء میں تحریکِ ختمِ نبوت نے احتجاجی طریقِ کار اختیار کرتے ہوئے شاندار کامیابی حاصل کی۔ اِس کامیابی کو مثال بناتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ماہنامہ ’’البلاغ‘‘ میں دینی سیاسی جماعتوں کو نفاذِ شریعت کے لیے احتجاجی طریقِ کار اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

’’جو حضرات اسلامی نظام کی خاطر سیاست میں اور پھر اسمبلی میں داخل ہوئے تھے وہ یہ سوچ کر مطمئن ہیں کہ جمہوریت اسلامی نظام کی پہلی سیڑھی ہے‘ لہٰذا اِس راہ میں ہماری ہر کوشش اسلام ہی کی خاطر ہے‘ جب یہ پہلی سیڑھی طے ہو جائے گی تو ہم اسلام کے لیے آگے بڑھیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ وقت ایسا فلسفی نہیں ہے جو اِن منطقی توجیہات کی رعایت کر کے اپنی رفتار بدل دے۔ اُس کا سفر تو لگاتار جاری ہے‘ اور الحاد و بے دینی کے جو بیج عرصۂ دراز پہلے بوئے گئے تھے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تناور درخت بن چکے ہیں‘ ان پر نت نئے پھل پھول آ رہے ہیں۔ ہم اٹھائیس سال☆ سے ان درختوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اس بات کے منتظر ہیں کہ پہلے ان تک پہنچنے کا راستہ صاف اور آرام دہ ہو‘ قطع نظر اس سے کہ جب تک یہ آرام دہ راستہ تیار ہوگا اُس وقت تک یہ درخت کتنے جوان اور توانا ہو چکیں گے اور ان کی آل اولاد پیدا ہو کر کتنی طاقت ور بن چکی ہوگی۔‘‘(۳)

بعد ازاں اپنی دردمندانہ گزارشات کا خلاصہ مفتی صاحب نے اِن الفاظ میں پیش فرمایا:

’’عرصہ سے ہماری سیاسی سرگرمیوں میں جمہوریت کے مطالبے کا عنصر زیادہ اور نفاذِ شریعت کے سنجیدہ مطالبے کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری دینی‘ سیاسی جماعتیں جمہوری آزادیوں کی طرف اِس درجہ متوجہ ہیں کہ اسلام کے نفاذ سے متعلق بہت سے ضروری کام نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ ہم نے ’’اسلامی نظریاتی کونسل‘‘ کو بطورِ مثال پیش کر کے عرض کیا تھا کہ بحالاتِ موجودہ نفاذِ شریعت کی جِدّوجُہد کا پہلا قدم اس کونسل کی اصلاح ہونا چاہیے اور افسوس کہ اِس کی طرف کسی نے بھی خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔‘‘(۴)

مفتی صاحب کی اِن گزارشات کو ہفت روزہ ’’ایشیا‘‘ کے مدیر نے اپنے اداریہ میں ’’سبکسارانِ ساحل‘‘ کا تبصرہ قرار دیا اور شکوہ کیا:

’’ان کے (یعنی البلاغ کے) اِس شکایت نامے میں طنز و تعریض کے کانٹوں کی چبھن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی۔‘‘(۵)

مدیر صاحب مزید لکھتے ہیں:

’’جو لوگ عملی سیاست کے خم و پیچ کا تجربہ نہیں رکھتے وہ اس کا کم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نکتۂ آغاز اور منزل کے درمیان کتنی وادیاں اور کتنے موڑ آتے ہیں‘ نیز یہ کہ ساحل پر

☆ یہ تحریر ۱۹۷۵ء کی ہے‘ یعنی قیام پاکستان کے اٹھائیس سال بعد کی۔

کھڑے لوگ حلقۂ موج کے اندر دام ہائے صد کام نہنگ سے واقف نہیں ہو سکتے۔‘‘(۶)

مفتی صاحب نے مدیر صاحب کے تأثر اور شکوہ کا جواب اِن الفاظ میں دیا:

’’اِن گزارشات سے ہمارا مقصد کسی نئے مباحثے کا دروازہ کھولنا اُس وقت تھا‘ نہ آج ہے۔ وہ تو اک دکھے ہوئے دل کی فریاد تھی جس میں تأثر کی شدت نے کچھ تلخ نوائی پیدا کر دی ہو تو اسے ہماری نااہلی سمجھ لیجیے کہ ہم سے ’’نالہ پابندِ نے‘‘ نہ ہو سکا اور اس سے اگر کسی حساس دل کو واقعتاً ٹھیس پہنچی ہے تو ہمیں معذرت خواہی میں بھی تأمل نہیں‘ کیونکہ ہمارا مقصد دلوں کو ٹھیس پہنچانا تھا ہی نہیں‘ البتہ جو بات ہم نے عرض کی تھی اس پر چونکہ ہمیں آج بھی اصرار ہے اس لیے ہم اس کی تھوڑی سی مزید تشریح آج پھر پیش کرنا چاہتے ہیں: ع شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات!‘‘(۷)

اس کے بعد مفتی صاحب تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ہماری گزارش یہ ہے کہ ہم سبکسارِ ساحل سہی لیکن کیا ہم جیسے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ موجوں سے برسرِ پیکار جیالوں کو یہ بتانے کا حق بھی نہیں رکھتے کہ آپ کے عقب پر ایک ہولناک طوفان حملہ آور ہے۔ آپ کی اس ہمت و شجاعت پر ہزار آفریں کہ آپ ’’آمریت‘‘ کے نہنگوں سے نبرد آزما ہیں تاکہ جب عوام اپنی رائے کا کھل کر اظہار کر سکیں تو ان کی کوششوں سے اسلام قائم ہو‘ لیکن نہنگوں کی اس فوج کی طرف توجہ دلانے والا گردن زدنی کیوں ہے جو سالہا سال سے لگاتار عوام کے دلوں سے اسلام کو کھرچنے میں مصروف ہے‘ تاکہ اگر کبھی عوام کو اظہارِ رائے کی مکمل آزادی نصیب ہو بھی جائے تو وہ اپنے اوپر خدا کے بجائے خواہشاتِ نفس کی حکمرانی قائم کریں‘ اور ان کی جمہوریت کے سائے میں انسدادِ فحاشی کے بجائے ہم جنس پرستی کے بل منظور ہوں۔ آپ اسلام کا مؤثر مطالبہ کرنے کے لیے اس بات کے منتظر ہیں کہ پہلے عوام کو تحریر و تقریر کے مواقع فراہم ہو جائیں اور وہ ان کے ذریعہ اسلام کی آواز بلند کر سکیں‘ لیکن اگر ان مواقع کے فراہم ہونے میں اٹھائیس سال اور لگ گئے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تحریر و تقریر کے یہ ذرائع کفر و الحاد کے پرچار اور لادینیت کے مطالبوں میں استعمال نہیں ہوں گے؟‘‘(۸)

مدیر صاحب نے بحالیٔ جمہوریت کی جِدّ و جُہد کو نفاذِ شریعت کا ابتدائی مرحلہ قرار دیا اور اسے بھی کارِ اجر و ثواب قرار دیا۔ مدیر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

’’جو عازمِ حج بنکوں‘ بازاروں اور ہسپتالوں کے چکّر کاٹتا ہے اس کی یہ سرگرمیاں بھی

عبادتِ حج کے ضمن میں آتی ہیں۔ اسی طرح جو شخص مسجد کی تعمیر کی لیے سرکاری دفتروں اور چندہ دینے والوں کے پاس بھاگ دوڑ کرتا ہے وہ بھی تعمیرِ مسجد ہی کا ثواب حاصل کر رہا ہے۔‘‘(۹)

مفتی صاحب اِس کے جواب میں رقم طراز ہیں:

’’ہم معاصر موصوف کے اس خیال سے حرف بحرف متفق ہیں‘ لیکن ہمارا سوال تو اس شخص کے بارے میں ہے جو حج کی درخواست اس لیے نہیں دیتا کہ ملک پر ظالم و جابر حکمران مسلّط ہیں اور پہلے انہیں اقتدار سے اتار کر ایک صحیح اسلامی حکومت قائم کرنا زیادہ ضروری ہے تاکہ لوگوں کو حج ادا کرنے کے لیے پریشانیاں اٹھانی نہ پڑیں اور وہ آزادی کے ساتھ یہ مقدّس عبادت ادا کر سکیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کا حکم آپ کے نزدیک کیا ہے؟ نیز اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو مسجدوں کی تعمیر کی سنجیدہ کوشش اس لیے نہیں کرتا کہ دراصل یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے اور پہلے حکومت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنا لیا جائے تو مسجدیں خود بخود تعمیر ہو جائیں گی۔

اتنی بات ہم جیسے سطح بینوں کے فہم سے بالاتر نہیں ہے کہ ایک عبادت کو ادا کرنے کے لیے جتنے کام ضروری ہوتے ہیں ان میں مصروف ہونا بھی عبادت ہی کا درجہ رکھتا ہے‘ لیکن اوّل تو ایسی ضروریات کی فہرست تیار کرنے میں زیادہ منطقی باریکیاں بھی بسا اوقات انسان کے اس ازلی دشمن کی طرف سے سجھائی جاتی ہیں جو کسی کو عبادت میں مصروف دیکھنا نہیں چاہتا۔ دوسرے‘ وضو کرنا بے شک نماز سے بے رخی نہیں‘ لیکن اگر کوئی شخص ساری زندگی وضو ہی کرتا رہے اور نماز کا نمبر ہی نہ آنے دے تو اسے کیا کہا جائے گا؟ یہ بات بلاشبہ نماز کے آداب میں داخل ہے کہ تمام اعضاء کو خوب اچھی طرح تین تین بار دھویا جائے‘ اس کے سنن و مستحبات کی پوری رعایت کی جائے اور اس میں پورے اطمینان کا مظاہرہ کیا جائے‘ لیکن اگر ان آداب و سنن میں مشغول ہونے سے نماز کا وقت نکل جانے کا اندیشہ ہو تو کیا ان آداب کی ادائیگی پر اصرار فرائض سے بے رخی نہیں کہلائے گا؟ فقہاء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی ایسی نماز کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو جس کی قضا نہیں ہو سکتی (مثلاً نمازِ جنازہ) تو وضو کے بجائے تیمّم ہی پر اکتفا کر لینا چاہیے۔ لیکن جو شخص ایسے وقت میں بھی وضو ہی نہیں اس کے تمام آداب کی ادائیگی پر مُصر ہو‘ کیا اس کی باریک بینی بھی قابلِ ستائش ہے؟‘‘(۱۰)

مدیر موصوف نے اِس کے جواب میں حزبِ اختلاف کی وہ خدمات شمار کی ہیں جن کے ذریعہ

ملک کو ایک قابلِ قبول دستور میسر ہوا۔ مفتی صاحب اِس پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

''ہمیں ان خدمات کا صدقِ دل سے اعتراف ہے' اور جہاں تک یاد ہے ہم نے اس کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا' لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ جب تک ملک کا کوئی دستور نہیں تھا' یا ایسا دستور تھا جسے بدلے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی تھی اس وقت تک حالات کچھ اور تھے' لیکن اب ایک ایسا آئین تیار ہو چکا ہے جس کے بارے میں حزبِ اختلاف کے رہنماؤں نے ہی بار بار اعتراف کیا ہے کہ وہ بعض قابلِ اصلاح امور کے باوجود بنیادی طور پر جمہوری ہے' کیا اب اسلام کی نام لیوا جماعتوں کو اپنی کوششوں کا رخ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ کیا اب بھی ''جمہوریت کی بحالی'' ہی ملک کا سب سے بنیادی اور سب سے اوّلین مسئلہ ہے؟ کیا اب بھی اسلام کے نفاذ کی مؤثر کوشش (معاذ اللہ) بے وقت کی راگنی ہے؟ اور کیا اب بھی تن من دھن داؤ پر لگانے' خونِ معصوم کا نذرانہ پیش کرنے اور عوام کا امن وسکون بھینٹ چڑھانے کے لیے ''جمہوریت'' ہی کی دیوی باقی رہ گئی ہے؟ اگر حکومت کی طرف سے کچھ ناروا پابندیاں اب بھی باقی ہیں تو انہیں اٹھانے کی جِدّوجُہد کا نفاذِ شریعت کی جِدّوجُہد سے آخر کیا تعارض ہے؟ آپ نفاذِ شریعت کی کوشش کو اوّلیت دے کر ساتھ ساتھ ان پابندیوں کے خلاف کوشش اب بھی جاری رکھ سکتے ہیں' لیکن ''پہلے جمہوریت پھر اسلام'' وہی پرانا فارمولا آخر کب تک چلتا رہے گا؟(۱۱)

مدیر صاحب نے اسلام کے لیے جِدّوجُہد کی رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

''آپ عوام کی رائے دین کے حق میں ہموار کرنے کے لیے نکلتے ہیں' لیکن دفعہ ۱۴۴ آپ کا راستہ روک لیتی ہے۔ آپ اس غلط روش پر تنقید یا احتجاج کرنا چاہتے ہیں' لیکن قلم پکڑ لیا جاتا ہے' اور زبان بند کر دی جاتی ہے۔ کیا آپ اسے سیاست کی دلدل کہہ کر پیچھے ہٹ جائیں گے' یا جدّوجُہد کے لیے اور بھی کمر بستہ ہو جائیں گے؟''(۱۲)

مفتی صاحب اِس دلیل کا جواب یوں دیتے ہیں:

''ہمیں معلوم نہیں کہ موجودہ حالات میں سیاسی جماعتوں کو پیچھے ہٹنے کا مشورہ کس نے دیا ہے' لیکن اس تصور کا کیا علاج ہے کہ نفاذِ شریعت کے لیے آگے بڑھنے کے مطالبے کو پیچھے ہٹنے کی تجویز سے تعبیر کیا جائے اور ''کمر بستہ'' صرف اُس شخص کو کہا جائے جو جمہوریت کے اندھے جھنڈے کے نیچے نعرے لگا رہا ہو؟ سوال یہ ہے کہ ختمِ نبوت کے لیے جو کامیاب تحریک چلائی گئی' دفعہ ۱۴۴ اِس کا راستہ کیوں نہیں روک سکی؟ قادیانیوں

کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے جب رائے عامہ ہموار کی گئی تو اُس وقت زبان وقلم پر لگی ہوئی ناروا پابندیاں کیوں آڑے نہیں آئیں؟ اس تحریک کے دوران بھی حکومت یہی تھی' ایمرجنسی بھی آج کی طرح قائم تھی' دفعہ ۱۴۴ کا ہتھیار بھی جگہ جگہ استعمال ہو رہا تھا' پریس پر پابندیاں بھی آج سے زیادہ تھیں' لیکن اِن تمام رکاوٹوں کے باوجود تحریکِ ختمِ نبوت پوری شان وشوکت کے ساتھ جاری رہی' اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اگر آپ اُس وقت بھی یہ دلیل استعمال فرماتے کہ جب تک جمہوری آزادیاں بحال نہ ہوں اُس وقت تک اس قسم کی تحریک چلانا بے سود ہے' اور بحالاتِ موجودہ ''بحالیٔ جمہوریت'' کے سوا کوئی اور تحریک چلانا بے کار ہے' تو کیا اُمّتِ مُسلمہ کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوسکتا؟

ہماری گزارش تو صرف اتنی تھی کہ ''اسلامی نظریاتی کونسل'' جس پر موجودہ دستور کے تحت نفاذِ شریعت کا دارومدار ہے اس کی اصلاح کے لیے کوئی مؤثر آواز کیوں بلند نہیں ہوتی؟ اور اس غرض کے لیے کوئی سوچی سمجھی تحریک کیوں نہیں چلائی جاتی؟ ہم فاضل معاصر سے بصد ادب یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارے سوال کا کوئی جواب ان کی طویل تحریر میں موجود ہے؟ جس طرح آپ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود جمہوریت کی بحالی کے لیے ''کمر بستہ'' ہو سکتے ہیں' جس طرح آپ زبان وقلم کی پابندیوں کے باوجود انتقالِ اقتدار کی تدبیریں سوچ سکتے ہیں' جس طرح آپ پریس کا گلا گھٹ جانے کے باوجود ''ختمِ نبوت'' کی تحریک چلا سکتے ہیں' اسی طرح ''نفاذِ شریعت'' کا ایک سوچا سمجھا پروگرام سوچ کر اور اس کے معیّن مطالبات طے کر کے اسلام کے لیے کوئی تحریک کیوں نہیں چلا سکتے؟

حقیقت یہ ہے کہ وقت کے اس اہم ترین سوال کا جواب برائے جواب دینا ہی پیشِ نظر ہو تو اس کی بہت سی تاویلات وتوجیہات اور دل کو تسلی دینے کی بہت سی باتیں سوچی جاسکتی ہیں' لیکن اگر ہم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس سوال کا وہ جواب تلاش کرنا چاہیں جو ہمارے ضمیر کو مطمئن کر سکے تو وہ اس کے سوا نہیں ہوگا کہ ''نفاذِ شریعت'' کا وہ جذبہ بیتاب ہمارے دلوں میں سرد پڑتا جا رہا ہے جو کوئی تحریک چلانے کے لیے روحِ رواں کا کام کرتا ہے۔ ''جمہوریت'' کے نعرے لگاتے لگاتے ہم نے اپنی ترجیحات کی ترتیب عملاً بدل ڈالی ہے۔ لادینی جماعتوں سے اشتراک کے نتیجے میں جمہوری آزادیوں کی بحالی اور حکومت بدلنے کی خواہش ہماری نظر میں ''نفاذِ شریعت'' سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے' ورنہ جس طرح ''تحریکِ ختمِ نبوت'' کے وقت واقعتاً جوش وخروش تھا اور دل

سے چاہا گیا تھا کہ یہ تحریک پوری شوکت کے ساتھ چلے‘ اس لیے دفعہ ۱۴۴ اور پریس کی پابندیاں اس تحریک کا راستہ نہ روک سکیں‘ اسی طرح اگر ’’نفاذِ اسلام‘‘ کی سچی تڑپ موجود ہو‘ ہم لادینی جماعتوں کے شور وشغب سے مرعوب ہونا چھوڑ دیں‘ اور اپنی سوچ بچار اور عملی جِدّ وجُہد میں ’’نفاذِ شریعت‘‘ کے مطالبے کو وہی اہمیت دیں جس کا وہ مستحق ہے تو یقین کیجیے کہ ’’دین کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کام‘‘ جو فاضل معاصر کے بقول دفعہ ۱۴۴ کی وجہ سے تعطل کا شکار ہے‘ آج بھی ہوسکتا ہے۔‘‘(۱۳)

اپنی گزارشات کے آخر میں مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

’’آخر میں یہ گزارش ضرور ہے کہ اسلام کی نام لیوا جماعتوں کی نیت نہ ہم پہلے زیر بحث لائے تھے اور نہ آج وہ زیر بحث ہے۔ ہماری معروضات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ خدانخواستہ ہم اسلام کی تمام نام لیوا جماعتوں کی نیت پر حملہ آور ہیں‘ بلکہ غلطیاں پوری نیک نیتی کے ساتھ بھی ہوسکتی ہیں۔ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی کام میں ایک نیک نیت شخص کا انہماک غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور بعض دوسرے پہلو اُس کی نظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں‘ اور ایک فرومایہ شخص جو اس کام میں منہمک نہیں اپنی ’’سبکسارئ ساحل‘‘ کے باوجود انہیں محسوس کرلیتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ ان خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلائے تو اس پر ملول ہونے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرلینا خواصی وشجاعت کے منافی نہیں‘ بلکہ اس کے عین مطابق ہے۔

ہم جس بات کو دیانتاً فیما بیننا وبین اللہ حق سمجھتے ہیں‘ اور جسے اپنے ملک کی دینی وسیاسی جماعتوں تک پہنچانا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے‘ اس کا اظہار آج دوبارہ ہم کرچکے۔ اگر ملت کے رہنماؤں کو ہماری ان دردمندانہ معروضات میں کوئی بات قابلِ قبول محسوس ہو تو اسے قبول فرمائیں اور اگر ہم اب بھی مطمئن نہ کرسکے ہوں تو اللہ اپنے دین کا کفیل ہے‘ اسی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی اور رہنمایانِ قوم کو بھی اس راستہ کی ہدایت فرمائے جو ملک و ملت کے لیے مفید تر ہو۔ آمین!‘‘(۱۴)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تو اس پر متفق ہیں کہ نفاذِ شریعت انتخابی طریقہ سے نہیں بلکہ احتجاجی طریقہ ہی سے ممکن ہے۔ الحمدللہ! سابق امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحبؒ بھی اب اسی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مورخہ ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو روزنامہ جنگ میں ’’ایک نئی انقلابی قیادت: پاکستان کی ضرورت‘‘ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

’’اس میں شک نہیں کہ آزاد اور غیر جانبدارانہ انتخاب وقت کی اہم ضرورت ہے اور ملک میں جمہوریت کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ بروقت غیر جانبدارانہ اور آزادانہ انتخابات کے مناسب انتظامات کیے جائیں‘ لیکن موجودہ حالات میں کسی عبوری حکومت کے لیے‘ چاہے اس کا سربراہ کتنا بھی غیر جانبدار اور امین کیوں نہ ہو‘ مکمل طور پر صاف ستھرے انتخابات منعقد کرنا ممکن نہیں ہوگا‘ کیونکہ انتخابی عمل میں انتخابی امیدواروں اور انتظامیہ کا بنیادی کردار ہوتا ہے اور فی الحال ہمیں وہ انتخابی عملہ اور وہ صاف ستھری انتظامیہ میسّر نہیں ہے۔ انتظامیہ کی اصلاح کرنا کسی عبوری حکومت کے بس کی بات نہیں‘ اس کے لیے کسی انقلابی حکومت کی ضرورت ہے۔ فی الحال انتخابات کے نتیجے میں ہمیں کسی انقلابی تبدیلی کی توقع نہیں کرنی چاہیے‘ البتہ جزوی اصلاح کے لیے نسبتاً بہتر حکومت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ہم جن سازشی طاقتوں کے نرغے میں ہیں اور جس گمبھیر صورتِ حال کا ہمیں سامنا ہے اس سے نکلنے کے لیے مصر اور تیونس کی طرز کے عرب بہار کی طرح ایک پاکستانی بہار کی ضرورت ہے۔‘‘

حواشی

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد‘ تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘ مکتبہ تنظیم اسلامی‘ جون ۲۰۰۵ء‘ ص ۳۹ تا ۴۰

(۲) ایضاً‘ ص ۴۰ تا ۴۲

(۳) مفتی محمد تقی عثمانی‘ نفاذِ شریعت اور اُس کے مسائل‘ مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴‘ رجب ۱۴۳۰ھ‘ ص ۱۰۸ تا ۱۰۹

(۴) ایضاً‘ ص ۱۰۵ (۵) ایضاً‘ ص ۱۰۶ (۶) ایضاً (۷) ایضاً (۸) ایضاً‘ ص ۱۰۶ تا ۱۰۷

(۹) ایضاً‘ ص ۱۰۷ (۱۰) ایضاً‘ ص ۱۰۷ تا ۱۰۸ (۱۱) ایضاً‘ ص ۱۰۹ (۱۲) ایضاً‘ ص ۱۰۹ تا ۱۱۰

(۱۳) ایضاً‘ ص ۱۱۰ تا ۱۱۱ (۱۴) ایضاً‘ ص ۱۱۱ تا ۱۱۲ ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

دورۂ ترجمہ قرآن کی مختصر تاریخ

عبدالرؤف

ماہ رمضان المبارک اور قرآن حکیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح دنوں میں سیدالایام جمعہ کا دن کہلاتا ہے‘ مہینوں میں رمضان المبارک کا بھی یہی مقام ہے۔ رمضان المبارک کی دوسری تمام مہینوں پر فضیلت کی ایک وجہ تو روزہ جیسی عظیم عبادت ہے۔ حالتِ روزہ میں انسان کا وہ حیوانی وجود جو بقیہ گیارہ مہینوں کے دوران میں تقویت پاتا ہے‘ کمزور ہوتا ہے۔ اس طرح روحانی وجود طاقت پکڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان کا اپنے مالک حقیقی سے تعلق استوار ہوتا ہے۔ فضیلت کی دوسری بڑی وجہ اس ماہ مبارک میں قرآن کا نزول ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

’’رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔‘‘

رمضان اور قرآن کے باہمی تعلق کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرامین میں کئی انداز سے پیش کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ، وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) (متفق علیہ)

’’جس نے رمضان کے روزے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے رکھے‘ اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے‘ اُس کے بھی سابقہ تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق شعبان کے آخری دن رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی فضیلت کے حوالے سے جو خطبہ ارشاد فرمایا‘ اس میں اس دو آتشہ تعلق کو یوں پیش فرمایا:

((شَهْرٌ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا)) (شعب الایمان)

’’اللہ تعالیٰ نے اس (ماہ) کے روزوں کو فرض قرار دیا اور قیام اللیل کو نفل قرار دیا۔‘‘

اس کے علاوہ ایک اور مقام پر رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

((اَلصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ، يَقُوْلُ الصِّيَامُ : اَيْ رَبِّ اِنِّيْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ، وَيَقُوْلُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ، فَيُشَفَّعَانِ)) (مسند احمد)

’’قیامت کے دن روزہ اور قرآن مجید بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا: ’’اے میرے ربّ! میں نے اس کو دن بھر کھانے اور پینے اور خواہشات سے روکے رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما‘‘ اور قرآن مجید کہے گا: ’’اے ربّ! میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔‘‘ پس دونوں کی شفاعت قبول کر لی جائے گی۔‘‘

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اس حدیث شریف سے بات بالکل منقح اور مبرہن ہو گئی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جس قیام کا ذکر ہے‘ اس سے اصل مراد اور اس کا منشا یہ ہے کہ رمضان کی راتیں یا ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ قرآن مجید کے ساتھ بسر کیا جائے۔ یقیناً اب آپ لوگ سمجھ لیں گے کہ میری اس رائے کی بنیاد کیا ہے کہ پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہونی چاہیے۔ اس حدیث سے نہ صرف یہ مترشح ہوتا ہے کہ افضل عمل یہ ہے کہ رمضان کی پوری رات قرآن مجید کے ساتھ گزرے‘ بلکہ اس حدیث کی رو سے یہ بات وجوب کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔‘‘

❁ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں بیان کیے گئے رمضان اور قرآن کے اس تعلق کو سامنے رکھتے ہوئے بانی تنظیم نے رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ بمطابق جون ۱۹۸۴ء سے جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی لاہور میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا۔ اس کا تذکرہ ماہ نامہ ’’میثاق‘‘ کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں سابق امیر تنظیم محترم حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے ان الفاظ میں کیا:

’’رمضان اور قرآن کا جو باہمی تعلق ہے‘ دینی ذوق رکھنے والے حضرات اس سے بخوبی

واقف ہیں۔ محترم والد صاحب رمضان المبارک سے متعلق اپنی تقاریر میں اس نکتے پر خاص زور دیا کرتے ہیں کہ دیگر تمام مہینوں پر رمضان المبارک کو جو فضیلت حاصل ہے‘ درحقیقت قرآن کی وجہ سے ہے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ اس مبارک مہینے کی رات میں قیام اللیل یا تراویح کا جو نظام دین میں قائم ہے‘ وہ دراصل قرآن حکیم کے ساتھ تجدید تعلق کا ایک پروگرام ہے۔ لہٰذا اس ماہ کے دوران اس بات کا بھرپور اہتمام کیا جانا چاہیے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح خطوط پر استوار ہو اور ہم زیادہ سے زیادہ وقت اس قرآن کو سننے اور اس کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش میں صرف کریں۔

جامع القرآن‘ قرآن اکیڈمی میں یوں تو ہر سال ہی تراویح کے ذیل میں خصوصی پروگرام ترتیب دیا جاتا رہا ہے لیکن اس سال دورۂ ترجمہ قرآن کا جو پروگرام یہاں چل رہا ہے وہ ایک منفرد شان کا حامل ہے اور غالباً اپنی طرز کی یہ پہلی کامیاب کوشش ہے۔ نماز تراویح کی ہر چار رکعتوں سے قبل ان میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ محترم والد صاحب بیان کرتے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے‘ ربط آیات کی جانب بھی اشارہ فرما دیتے ہیں۔ اس طرح کل پانچ مرحلوں میں تراویح کا پروگرام مکمل ہوتا ہے۔ ہر چار رکعتوں اور اس سے قبل ترجمے کے بیان میں اوسطاً ۵۰ / ۵۵ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر چار سے ساڑھے چار گھنٹوں کے مابین یہ پروگرام مکمل ہوتا ہے۔ رات ساڑھے نو بجے عشاء کی جماعت کھڑی ہوتی ہے اور رات گئے دو بجے یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ چونکہ اس کے فوراً بعد سحری کھانے کا وقت ہوتا ہے‘ اس طرح گویا تمام رات نماز تراویح اور دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام میں گزرتی ہے۔

پروگرام کی طوالت اور موسم کی شدت کے پیش نظر ابتداءً خیال تھا کہ پروگرام بہت کٹھن ہو جائے گا اور اس میں شرکاء کی تعداد بہت کم رہے گی‘ لیکن یہ اللہ کا خصوصی فضل و کرم ہے کہ اس نے بظاہر اس کٹھن پروگرام کو شرکاء کے لیے بہت آسان بنا دیا۔ ان کا عام تاثر یہ ہے کہ یہ پروگرام اتنا مفید اور پُرکشش ہے کہ پوری رات جاگنے کے باوجود کسی مرحلے پر بھی بوریت یا گرانی کا احساس نہیں ہوتا اور یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور اس کے کلام کی برکت کا مظہر ہے۔

اس ماہ مبارک کے آغاز میں مذکورہ بالا پروگرام میں شرکاء کی تعداد تقریباً دو صد تھی لیکن

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شرکاء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا اور اب آخری عشرے کے آغاز سے یہ تعداد ساڑھے تین صد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة!

❁ حسبِ سابق‘ آئندہ سال رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ میں بھی بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن کی تکمیل کی۔ دورۂ ترجمہ قرآن کی اس کیفیت کو بانیٔ تنظیم کے دیرینہ ساتھی مولانا شیخ رحیم الدین نے ماہنامہ ’’میثاق‘‘ کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۸۵ء میں اس انداز سے بیان کیا:

> ’’گزشتہ سال کی افادیت اور ذوق و شوق کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس سال بھی قرآن اکیڈمی میں رمضان المبارک کے دوران نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ یہ رمضان المبارک مئی اور جون کے شدید ترین گرم موسم میں تھا۔ اس کے باوجود قرآن حکیم سے محبت و شفقت اور وابستگی رکھنے والے حضرات نے دن میں روزہ کی مشقت برداشت کی اور پھر راتیں اس کیفیت میں گزاریں کہ یا تو تراویح میں قرآن مجید کی سماعت ہو رہی ہے یا پھر پورے توجہ و انہماک اور ذوق و شوق کے ساتھ قرآن کا ترجمہ‘ اس کے علوم و معارف اور احکامات کو کانوں کے راستے ذہن و قلب میں اتارا جا رہا ہے۔ گویا پوری رات قرآن حکیم کے ساتھ بسر ہو رہی ہے۔‘‘

❁ اس سے اگلے سال رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ بمطابق ۱۹۸۶ء میں بانیٔ تنظیم نے کراچی کے رفقاء کے شدید اصرار پر ناظم آباد (پاپوش نگر) بلاک نمبر ۵ کی جامع مسجد میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ لاہور میں آپ کی کمی اس طرح پوری کی گئی کہ قرآن اکیڈمی میں معروف علمی شخصیت‘ سابق چیئرمین شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی‘ استاد قرآن اکیڈمی‘ لاہور محترم پروفیسر حافظ احمد یار جبکہ تنظیم اسلامی کے نئے تعمیر شدہ مرکزی دفتر گڑھی شاہو لاہور میں یہ سعادت رفیق تنظیم اور بانیٔ محترم کے داماد محترم ڈاکٹر عبدالخالق نے حاصل کی۔ اس طرح ایک اور ایک گیارہ کے مصداق رمضان المبارک میں قرآن کی سماعت کے ساتھ تذکّر و تدبّر کی جس سعی کا آغاز فردِ واحد ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ذریعے ہوا‘ اس میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا جو اب تک ۱۰۰ سے زیادہ کی تعداد تک پہنچ چکا ہے۔ اس کی انتہا کہاں ہوتی ہے‘ خدا ہی جانے!

❁ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ بمطابق ۱۹۸۷ء: ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی جبکہ اس کے علاوہ تین مزید مقامات پر بھی یہ رونق لگی۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ بمطابق ۱۹۸۸ء: بانی محترم نے قرآن اکیڈمی لاہور میں ہی دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ بمطابق ۱۹۸۹ء: بانی تنظیم نے رفقاء متحدہ عرب امارات کے شدید اصرار پر مرکز پاکستان' ابوظہبی کی جامع مسجد میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ کثیر تعداد میں رفقاء واحباب نے پابندیٔ وقت اور ذوق وشوق کے ساتھ پورا مہینہ شرکت کی۔ پروفیسر حافظ احمد یارؒ نے قرآن اکیڈمی لاہور میں' چودھری رحمت اللہ بٹر نے مسجد طوبیٰ' نواں کوٹ' لاہور میں' حافظ محمد رفیق نے کراچی کی' ایک جامع مسجد میں' جبکہ مرکزی دفتر تنظیم' گڑھی شاہو' لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن بذریعہ ویڈیو بانی محترم یہ سعادت حاصل کی گئی۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ بمطابق ۱۹۹۰ء: بانی تنظیم نے جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ بمطابق ۱۹۹۱ء: بانی تنظیم نے قرآن اکیڈمی' ڈیفنس' کراچی کی زیرِتعمیر عمارت میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ جامع القرآن' قرآن اکیڈمی' لاہور میں یہ سعادت محترم حافظ عاکف سعید نے حاصل کی جن کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ الحمدللہ' انہوں نے انتہائی پُراعتماد لہجے میں بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھائی۔ حافظ محمد رفیق نے رضا بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن کی جامع مسجد میں دورہ کرایا' جبکہ مرکزی دفتر تنظیم' گڑھی شاہو اور قرآن سکول' وسن پورہ سمیت پانچ مقامات پر بانی تنظیم کی ویڈیو کیسٹ کے ذریعے قرآن حکیم کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ بمطابق ۱۹۹۲ء: بانی تنظیم نے قرآن اکیڈمی' آفیسرز کالونی' ملتان کی زیرِتعمیر عمارت میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی جبکہ لاہور میں قرآن اکیڈمی اور دیگر مقامات پر حسبِ سابق دورہ ہائے ترجمہ قرآن کا انعقاد ہوا۔

❁ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ بمطابق ۱۹۹۳ء: بانی تنظیم تو اپنے طویل غیر ملکی سفر کے سبب دورۂ ترجمہ قرآن نہ کرا سکے لیکن بقول مجروح سلطان پوری ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

کے مصداق یہ تحریک وسعت پزیر ہونا شروع ہوگئی اور کثیر تعداد میں مرد وزن اور پیر وجواں قرآن حکیم کے ترجمے سے مستفید ہونا شروع ہو گئے۔ لہٰذا اس سال لاہور میں چار مقامات پر محترم حافظ عاکف سعید' چودھری رحمت اللہ بٹر' فتح محمد قریشی اور نعیم اختر عدنان صاحبان نے سعادت حاصل کی جبکہ تین مقامات پر بذریعہ ویڈیو بانی تنظیم استفادہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع' ملتان میں جناب مختار حسین فاروقی اور کراچی میں انجینئر نوید احمد نے یہ سعادت حاصل کی۔

❁ ۱۴۱۴ھ بمطابق ۱۹۹۴ء: قرآن اکیڈمی لاہور میں ایک بار پھر بانی تنظیم نے دورہ کی سعادت حاصل کی جبکہ لاہور کے دیگر مقامات پر حسبِ سابق رفقاء تنظیم نے بھی یہ ذمہ داری ادا کی اور بذریعہ ویڈیو بھی دورۂ ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا گیا۔ اس سال کی خاص بات یہ تھی کہ یہ سلسلہ بڑھتا بڑھتا کراچی' ملتان' فیصل آباد' پشاور اور راولپنڈی اسلام آباد تک دراز ہو گیا۔

❁ ۱۴۱۵ھ بمطابق ۱۹۹۵ء: یہ سال دورۂ ترجمہ قرآن کی تاریخ میں اس اعتبار سے انفرادیت کا حامل ہے کہ بانی محترم نے اسے قومی سے بین الاقوامی بنانے کا فیصلہ کیا اور امریکہ کے شہر نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن کی مسجد الرحمٰن میں انگریزی میں دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کر دیا گیا۔ البتہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا' اس لیے کہ بانی محترم کے گھٹنوں کی تکلیف پانچویں رات سے شدت اختیار کر گئی جس کی وجہ سے اسے مزید جاری رکھنا ممکن نہ رہا۔ پروگرام کی معطلی کا اعلان شرکاء پروگرام نے نہایت رنج اور صدمے کی کیفیت کے ساتھ سنا لیکن ع ''فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا'' کے مصداق جوں ہی افاقہ ہوا تو بانی محترم نے رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اسی مسجد میں انگریزی زبان میں منتخب نصاب کے دروس کا آغاز کر دیا۔ اس طرح گزشتہ سال امریکہ ہی میں منتخب نصاب کے دروس کا جو سلسلہ نامکمل رہ گیا تھا وہ الحمدللہ کامیابی سے مکمل پا گیا۔ پاکستان میں فطری انداز سے مختلف شہروں میں دورۂ ترجمہ قرآن کا انعقاد عمل میں آیا۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں یہ سعادت محترم مختار حسین فاروقی نے حاصل کی۔

❁ ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۹۹۶ء: بانی محترم نے گزشتہ سال کی تلافی کرتے ہوئے امریکہ میں انگریزی میں دورۂ ترجمہ قرآن کرایا۔ اس طرح مکمل تو نہیں لیکن پندرہ پاروں کا دورہ بزبان انگریزی تکمیل پا گیا۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں سینئر رفیق محترم ڈاکٹر عبدالسمیع نے دورۂ ترجمہ

قرآن کی سعادت حاصل کی۔ علاوہ ازیں ملک بھر میں دورۂ ترجمہ قرآن کے بیسیوں حلقے قائم ہوئے جن میں ہزاروں طالبانِ قرآن رمضان المبارک کی راتوں میں قرآن مجید کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید میں مصروف رہے۔

❁ ۱۴۱۷ھ بمطابق ۱۹۹۷ء: یہ سال بانیٔ تنظیم کی برپا کی گئی دعوت رجوع الی القرآن کے اہم ترین حصے دورہ ہائے ترجمہ قرآن میں مزید اضافہ اور برکت کا باعث بنا۔ اس سال پاکستان میں تنظیم اسلامی کے مختلف حلقہ جات میں دورہ ہائے ترجمہ قرآن کی تعداد اس طرح رہی:

حلقہ لاہور ڈویژن	۹ مقامات	حلقہ پنجاب شمالی	۸ مقامات
حلقہ پنجاب جنوبی	۲ مقامات	حلقہ پنجاب غربی	۶ مقامات
حلقہ آزاد کشمیر	۱ مقام	حلقہ سرحد	۱ مقام
حلقہ کراچی	۱۲ مقامات		

❁ ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۸ء میں فیصلہ کیا گیا کہ بانی تنظیم کے دورۂ ترجمہ قرآن کی بہترین ریکارڈنگ کرائی جائے تاکہ بڑے پیمانے پر الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے عوام الناس تک دین حق کی دعوت پہنچ سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے قرعۂ فال قرآن اکیڈمی' ڈیفنس' کراچی کے نام نکلا۔ اس سال دورۂ ترجمہ قرآن کا پیغام میڈیا کے ذریعے بھی دنیا کے کروڑوں انسانوں تک نہ صرف پہنچا بلکہ ابھی تک پہنچ رہا ہے۔ بعد ازاں اسی کو قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات نے ترتیب وتسوید اور تہذیب وتدوین کے مراحل سے گزار کر ''بیان القرآن'' کے نام سے کتابی شکل دی' جو اوّلاً سات اور بعد ازاں چار جلدوں میں طبع ہو کر لاکھوں لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ گزشتہ سال شعبہ مطبوعات نے ''بیان القرآن'' کے ترجمہ اور منتخب حواشی کے ساتھ ''مختصر بیان القرآن'' تیار کیا' جس کی الحمدللہ سال بھر میں پانچ اشاعتیں طبع ہو چکی ہیں۔

❁ ۱۴۱۹ھ بمطابق ۱۹۹۹ء: بانی محترم نے ناسازیٔ طبع کی وجہ سے قرآن اکیڈمی لاہور میں خلاصہ مباحث قرآن کی شکل میں جبکہ لاہور اور ملک کے باقی شہروں میں ۲۵ مقامات پر بانیٔ محترم کے شاگردوں نے دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ تین مقامات پر خواتین نے دورہ کرایا جبکہ ۳۵ مقامات پر بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمہ قرآن سے استفادہ کیا گیا۔

❁ ۱۴۲۰ھ بمطابق ۲۰۰۰ء: بانی محترم نے قرآن اکیڈمی لاہور میں جبکہ سابق امیر تنظیم محترم حافظ عاکف سعید نے امریکہ کے شہر شکاگو میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ اس کے علاوہ پاکستان کے طول وعرض میں ۸۰ مقامات پر مدرّسین تنظیم اور بذریعہ ویڈیو دورۂ ترجمہ کے پروگراموں کا انعقاد ہوا جس میں زیادہ تر مکمل دورۂ ترجمہ قرآن اور بعض جگہوں پر خلاصہ مباحث قرآن یا قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا مطالعہ کرایا گیا۔ علاوہ ازیں' حلقہ خواتین کے زیر اہتمام بھی چھ مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن کا انعقاد کیا گیا۔

❁ ۱۴۲۱ھ بمطابق ۲۰۰۰ء: گزشتہ سال کے ماہ رمضان کی طرح اس سال بھی رمضان کا مہینہ شمسی تقویم کے اعتبار سے ۲۰۰۰ء میں آیا' فرق صرف یہ تھا کہ پہلے جنوری ۲۰۰۰ء میں آیا جبکہ اب دسمبر ۲۰۰۰ء میں۔ اس سال بانیٔ تنظیم نے نیویارک میں بزبانِ انگریزی دورہ کرا کر بقایا ۱۵ پاروں کی تکمیل کی جبکہ محترم حافظ عاکف سعید نے شکاگو میں اور جناب ڈاکٹر طاہر خاکوانی نے نیویارک میں یہ سعادت حاصل کی۔ اس طرح امریکہ میں ایک ہی وقت میں تین مقامات پر قرآن کا پیغام اردو اور انگریزی جاننے والے افراد میں وسیع پیمانے تک پہنچا۔ قرآن اکیڈمی لاہور میں یہ سعادت محترم ڈاکٹر عارف رشید نے حاصل کی جبکہ ملک میں سو کے قریب مقامات پر دورۂ ترجمہ قرآن اور خلاصہ مباحث قرآن کے پروگراموں کا انعقاد ہوا۔ کراچی اور لاہور اس اعتبار سے سرفہرست رہے کہ دونوں شہروں میں بالترتیب ۲۰ اور ۱۵ مقامات پر یہ سعادت حاصل کی گئی۔ اس سال کی خاص بات کراچی کے حلقہ خواتین کا کم وبیش دس مقامات پر دورے کی سعادت حاصل کرنا تھا۔

❁ ۱۴۲۲ھ بمطابق ۲۰۰۱ء سے ۱۴۴۵ھ بمطابق ۲۰۲۴ء تک: فردِ واحد یعنی بانیٔ تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ذات سے دورۂ ترجمہ قرآن کی شکل میں جس قرآنی دعوت کا آغاز ہوا تھا اس کی تعداد ۱۵۰ سے تجاوز کر گئی اور مدرسین کا معیار بھی ہر آنے والے دن بہتر سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ یہ مثالی تحریک پاکستان کے کم وبیش تمام بڑے شہروں اور قصبات تک رسائی حاصل کرنے میں نہ صرف کامیاب رہی بلکہ لاکھوں مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب لا کر ہزاروں خاندانوں کی ہدایت کا سبب بن گئی۔ یہاں تک کہ روایتی مذہبی تصور کے حامل علماء کی توجہات کا مرکز بھی بن گئی۔ بہت سے علماء اور مفتیانِ کرام نے اپنی مساجد میں کہیں دورۂ ترجمہ قرآن اور

کہیں خلاصہ مباحث قرآن کی شکل میں اپنے متوسلین کا قرآن کے ساتھ تعلق جوڑنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بانی تنظیم محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی یہی وہ کوشش تھی جس کو ان کی وفات کے بعد کراچی کے ایک جیّد عالم مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا کہ: ''ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر نے ہمیں (یعنی علماء کو) ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔''

اس دوران میں ۲۰۲۰ء کے رمضان المبارک میں کورونا وبا کے باعث لاک ڈاؤن کی وجہ سے حکومت کی طرف سے لگائی جانے والی پابندی کے باعث دورۂ ترجمہ قرآن کا انعقاد نہیں ہو سکا' البتہ اس شر میں سے ایک بہت بڑا خیر یہ برآمد ہوا کہ امیر تنظیم اسلامی محترم شجاع الدین شیخ کو QTV پر دورۂ ترجمہ قرآن کرانے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح ۲۰۲۰ء سے ۲۰۲۴ء تک مسلسل پانچ سال سے قرآن کا پیغام QTV کے ذریعہ دنیا کے کم و بیش ۱۴۴ ممالک تک پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ وہ خدمتِ قرآن کی اس پُرخلوص جِدّ و جُہد کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ اس کے نتیجے میں اپنے دین متین کے غلبے کی راہ ہموار کر دے تاکہ ہماری زندگی میں قرآن حکیم کے ان الفاظ کی حقانیت واضح ہو جائے کہ وہ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (آلِ عمران)

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 400 روپے، اشاعت عام 150 روپے

علّامہ اقبال کی وابستگیٔ رسولؐ

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

یہ حیاتِ اقبال کا ایک معروف واقعہ ہے' جسے خود اقبال نے اپنی فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' (۱۹۱۸ء) میں بیان کیا ہے۔ مثنوی کے متعلقہ حصے کا عنوان ہے: ''در معنیٔ ایں کہ حسنِ سیرتِ ملّیہ از تادّب بآدابِ محمدیہ است''، یعنی اس مضمون کی وضاحت میں کہ ملّتِ اسلامیہ کا حسنِ سیرت و کردار' آدابِ محمدیہ (ﷺ) کی اتباع میں ہے۔

علّامہ اقبال بتاتے ہیں کہ میرے لڑکپن کا زمانہ' بلکہ آغازِ عہدِ شباب تھا۔ ایک روز ایک بھکاری ہمارے گھر کے دروازے پر آیا اور اُونچی اُونچی آواز سے بھیک مانگنے لگا۔ میں نے چاہا کہ وہ ٹل جائے مگر وہ پیہم صدا بلند کرتا رہا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ جوشِ جذبات میں مجھے اچھے بُرے کی تمیز نہ رہی' اور میں نے اس کے سر پر ایک لاٹھی دے ماری۔ اس نے اِدھر اُدھر سے بھیک مانگ کر جو کچھ بھی جمع کیا تھا' وہ سب کچھ اس کی جھولی سے زمین پر گر گیا۔ والد صاحب یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میری اس حرکت سے بے حد آزردہ ہوئے' چہرہ مرجھا گیا اور افسردگی چھا گئی۔ ان کے لبوں سے ایک جگر سوز آہ نکلی' اور دل سینے میں تڑپ اُٹھا۔ ستارے جیسا ایک آنسو آنکھوں سے نکلا' پلکوں پر چمکا اور گر گیا۔

یہ دیکھ کر مجھے بے حد ندامت اور خفّت ہوئی کہ میں نے والد کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اپنی اس حرکت پر بے قرار بھی ہوا (کہ اب تلافی کیسے ہو؟)۔ اسی کیفیت میں والد ماجد کہنے لگے: اُمّتِ مُسلمہ کل اپنے آقا رسول اللہ ﷺ کے سامنے جمع ہوگی۔ ان میں ہر طبقے کے لوگ ہوں گے: غازی' حُفّاظِ حدیث' شُہداء' اکابرِ اُمّت' زاہد' عالم اور گنہگار بھی۔ اس موقع پر اس دردمند گدا کی صدا بلند ہوگی (وہ فریاد کرے گا کہ مجھ سے ایک نوجوان نے زیادتی کی ہے)۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ مجھ سے مخاطب ہوں گے: ؎

حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نہ شد
یعنی آں انبارِ گِل آدم نہ شد!

''حق تعالیٰ نے ایک مسلمان نوجوان کو تیرے سپرد کیا تھا (کہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے) لیکن اس نوجوان نے میری ادب گاہ سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ (حضور ﷺ فرمائیں گے کہ) تو اس آسان سے کام کو بھی انجام نہ دے سکا' یعنی تجھ سے ایک تو وہ مٹی آدمی نہ بن سکا۔''

والد نے فرمایا کہ اگرچہ آنحضور ﷺ اس ملامت میں بھی نرم گفتار ہی ہوں مگر میں تو سخت خفیف اور شرمندہ ہوں گا اور اُمید و بیم میں گرفتار ہوں گا۔ پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا: بیٹا! ذرا سوچو اور رسول اللہ ﷺ کی اُمّت کے جمع ہونے کا منظر تصور میں لاؤ' پھر میری یہ سفید ڈاڑھی دیکھو اور میرے اُمید و بیم کے لرزے کو نگاہ میں رکھو۔ اس کے بعد بڑے دردمندانہ لہجے میں کہنے لگے: ؎

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچہ ای از شاخسارِ مصطفیٰؐ
گل شو از بادِ بہار مصطفیٰؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلقِ اُو باید گرفت

''(دیکھو' بیٹا) اپنے باپ پر یہ نازیبا ظلم نہ کرو۔ (کل) آقا کے سامنے غلام کو رسوا نہ کرنا۔ تو شاخسارِ مصطفیٰ ﷺ کا ایک غنچہ ہے' حضورؐ ہی کی نسیمِ بہار سے شگفتہ ہو کر پھول بن جا۔ تجھے آپ ﷺ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیے اور تجھے آپؐ کے خلقِ عظیم کی اتباع کرنی چاہیے۔''

وجوہات تو اور بھی ہیں' مثلاً اقبال کے گھرانے کی دین سے گہری وابستگی' مذہبی شعائر کی پابندی' والدۂ اقبال کا جذبۂ خدمتِ خلق' پھر علّامہ میر حسن کی علمی اور اخلاقی تربیت اور خود اقبال کے والد شیخ نور محمد کا روحانی مزاج' نیک نفسی' اور پرہیزگاری وغیرہ —— لیکن راقم کی دانست

میں یہی وہ واقعہ ہے جس نے اقبال کے قلب و ذہن میں' آخرت میں جواب دہی کے احساس و شعور کو بیدار کیا اور ان کے نیک طینت والد نے اپنی مذکورہ بالا دل سوز و دردمندانہ گفتگو اور پند و نصیحت کے ذریعے' ان کے دل میں رسول کریم ﷺ کے ساتھ دلی محبت اور وابستگی کا بیج بو یا —— اقبال کی شاعری اور شخصیت میں یہ بیج ایک تن آور' اور بلند و بالا اور اطراف میں خوب پھیلی ہوئی شاخوں والا گھنا درخت بن کر نمودار ہوا —— ﴿كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ (ابراھیم: ۲۴)

عین ممکن ہے اقبال کے لڑکپن میں اسی طرح کے کچھ اور واقعات بھی رونما ہوئے ہوں' تاہم بالیقین یہ واقعہ اقبال کی محبتِ رسولؐ میں ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اوائلِ عمر کے بعض وقوعات انسانی ذہن پر گہرے اور دُور رس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ متذکرہ بالا واقعہ نوجوان محمد اقبال کے قلب و دماغ پر مرتسم ہو کر رہ گیا اور پھر پایانِ عمر وقتاً فوقتاً اور طرح طرح سے اظہار ہوتا رہا۔

علّامہ اقبال کی زندگی' شخصیت' شاعری اور نثر نگاری کا مطالعہ کریں تو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ان کا تعلق خاطر' ایک قلبی و ذہنی وابستگی اور عشق و محبت کا جذبہ مطالعۂ اقبال کا ایک نمایاں اور زرّیں باب نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر دور میں عشقِ رسولؐ ایک زندہ' توانا اور انقلاب انگیز جذبے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ یہ حکایت دراز ہے اور لذیذ بھی' لیکن فی الوقت یہاں اس کے فقط چند پہلو پیش کیے جا رہے ہیں:

ابتدا ہی سے اقبال کی شاعری میں جذبۂ عشقِ رسول ﷺ کا ایک والہانہ اظہار ملتا ہے مگر اظہارِ عقیدت کا انداز بالعموم رسمی و روایتی ہے۔ وہ اس عبوری دور سے آگے بڑھتے ہیں تو اُن کی توصیفِ محمد ﷺ میں ہمیں ایک خاص معنویت نظر آتی ہے' مثلاً آں حضور ﷺ کی پیغمبرانہ اور بشری عظمت اور آپؐ کی رحمت و شفقت کا پہلو اُن کے لیے سب سے زیادہ جذب و کشش کا باعث بنتا ہے۔ ابتدائی نظموں میں سے ''نالۂ یتیم'' کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

درد جو انساں کا تھا' وہ تیرے پہلو سے اُٹھا
قلزمِ جوشِ محبت' تیرے آنسو سے اُٹھا

نظم ''فریادِ اُمّت'' کے متعدد شعروں میں عشق و محبت سے اقبال کی مراد دردِ انسانیت ہے' اور یہ

دردِ عشقِ رسول ﷺ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

تیری اُلفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا[1]

پھر ''رموزِ بے خودی'' میں کہتے ہیں:

تا دمِ تو آتشے از گِل کشود
تودہ ہائے خاک را آدم نمود

''آپؐ کے نفسِ گرم سے مٹی کے پیکروں نے آگ پیدا کی اور خاک کے تودوں نے آدم کی صورت اختیار کر لی۔''

گویا' اقبال کے نزدیک نبی کریم ﷺ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے ''انسان سازی'' کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔ آپؐ نے اپنی ۲۳ سالہ مثالی زندگی میں جو گوناگوں کارنامے انجام دیے' اقبال کی شاعری میں مختلف مقامات پر ان کا ذکر ملتا ہے۔ ایک مفصّل تذکرہ تو ''رموزِ بے خودی'' کے آخری باب بعنوان: ''عرضِ حالِ مصنف بحضورِ رحمۃ للعالمینؐ'' میں کیا گیا ہے:

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ اَت تعبیرِ خوابِ زندگی

''حضورِ والاؐ! آپ کا ظہور زندگی کے لیے شباب کا باعث ہے۔ آپ کا جلوہ خوابِ زندگی کی تعبیر ہے۔''

فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں ''درحضورِ رسالت مآب ﷺ'' کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جسے اقبال نے پروفیسر سلاح الدین محمد الیاس برنی کے نام ایک خط میں (حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک) ''عرض داشت'' کہا ہے۔ یہ ان کی نعتیہ شاعری کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔ اس میں ملّت اسلامیہ کی کس مپرسی' بے چارگی اور خواری و زبوں حالی کا حوالہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

علّامہ اقبال سب سے پہلے انسانیت پر نبی کریم ﷺ کے احسانِ عظیم کا ذکر کرتے ہیں کہ آپؐ نے اُسے لات و منات اور چوپایوں اور کاہنوں کی عبدیت (غلامی) کے بوجھ سے آزاد

کیا اور اُمراء وسلاطین کی غلامی کے چنگل سے نجات دلائی۔ پھر افرادِ اُمّت کی موجودہ حالتِ زبوں کا ذکر کرتے ہوئے افرادِ اُمّت کے مختلف طبقوں (نوجوانوں' اہلِ مکتب' افرنگ کے نقالوں) کی ذہنی پستی اور پس ماندگی پر رنج وتأسف کا اظہار کرتے ہیں: ؎

در عجم گردیدم و ہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر
آرزو در سینۂ او زود میر
ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حریت اندیشۂ او را حرام

''میں عجم میں بھی پھرا ہوں اور عرب میں بھی۔ بولہب زیادہ ہیں اور آپ ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگ نایاب ہیں۔ یہ روشن دماغ مسلمان زادہ' اس کے ضمیر کی اندھیر نگری چراغ کے بغیر ہے۔ یہ جوانی میں ریشم کی طرح نرم و نازک ہے۔ اس کے سینے میں آرزوئیں پیدا ہوتے ہی مرجاتی ہیں۔ اس غلام ابن غلام ابن غلام پر آزادی کی سوچ حرام ہے۔''

پھر کہتے ہیں کہ جدید تعلیم نے اس سے دین کا جذبہ چھین لیا ہے۔ اور اب تو وہ ایک بے جان لاشہ ہے' اس کا وجود: ''ایں قدر دانم کہ بود' (اتنا جانتا ہوں کہ کبھی ''تھا'' ——) یہ نوجوان اپنے آپ سے ناآشنا ہے اور افکارِ فرنگ میں مست ہے۔ یہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ فرنگیوں کے ہاتھ سے اسے جو کی روٹی مل جائے۔ اس فاقہ کش نے اپنی جانِ پاک دے کر روٹی خریدی۔ اس کے اس طرزِ عمل نے ہمیں دردناک نالوں پر مجبور کر دیا۔ یہ پالتو پرندوں کی طرح (دوسروں کے ہاتھ سے) دانہ چگتا ہے اور فضائے نیلگوں کی پہنائیوں سے ناآشنا ہے۔ فرنگیوں کی آگ نے اسے پگھلا دیا ہے۔ اس دوزخ نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اسکول کا استاد نالائق اور کم نظر ہے' اس نے نوجوان کو اس کے حقیقی مقام سے آگاہ نہیں کیا۔

اقبال اُمّت کے امراض سے بخوبی واقف تھے' جن میں سے ایک بڑی بیماری ''ترسِ

مرگ'' ہے۔ اس نظم کے ابتدا میں انہوں نے فریاد کی تھی کہ: ؎

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ!

''حضور ﷺ! آپ ہم بے چارہ لوگوں کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ اس قوم کو موت کے خوف سے نجات دلایئے۔''

یہاں وہ اس تأسف کا اظہار کرتے ہیں کہ ؎

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لا غالب اِلّا اللہ نیست

''مؤمن ہے اور موت کی رمز سے آگاہ نہیں۔ اس کا دل لا غالب الّا اللہ (کے تصور) سے خالی ہے۔''

اقبال نے اس نوحہ وفریاد میں ایک ایسی بات کہی ہے جو ان کے دور میں تو سچی تھی ہی' آج ۷۰ سال بعد' دورِ اقبال سے کہیں زیادہ ہمارے حسبِ حال ہے —— کہتے ہیں: ؎

ما ہمہ افسونیٔ تہذیبِ غرب
کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب

''ہم سب مغرب کی تہذیب کے سحر زدہ ہیں۔ ہمیں افرنگیوں نے بغیر جدال وقتال کے قتل کر دیا ہے۔''

تاہم' اقبال کو علم نہیں تھا کہ جب یہ سخت جان اُمّت' صرف تعلیم اور (نام نہاد) ثقافتی حربوں کے ذریعے پوری طرح بے جان نہ ہو سکے گی تو فرنگی جدال وقتال پر بھی اتر آئیں گے —— (یہ الگ بات ہے کہ اس محاذ پر بھی انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔)

علّامہ اقبال کے حُبِّ رسولؐ کے جذبے پر ایک اور پہلو سے بھی نظر ڈالنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہمارے معاشرے میں حُبِّ رسولؐ اور عشقِ رسولؐ کا جذبہ چند ظاہری آداب (نعت نویسی' نعت خوانی' مجلسِ میلاد' میلاد النبی ﷺ کا جلوس یا رسمی و روایتی انداز میں دھواں دھار تقریروں) تک محدود ہو کر رہ گیا ہے' اور الا ماشاء اللہ اب یہ ہمارا ایک ''ثقافتی مظہر'' ہے۔ لیکن علّامہ اقبال کی محبتِ رسولؐ فقط آپؐ کی زبانی کلامی توصیف وتحسین یا درود وسلام تک محدود نہیں

(گو کہ علّامہ اقبال نے نبی کریم ﷺ پر بکثرت درود شریف پڑھنے کی تلقین کی ہے)۔ وہ محبتِ رسولؐ کو خدمتِ رسولؐ اور خدمتِ رسولؐ کو خدمتِ دین کے مترادف سمجھتے ہیں‘ یعنی ان کے نزدیک:

محبتِ رسولؐ = خدمتِ رسولؐ

اور:

خدمتِ رسولؐ = خدمتِ اسلام

چنانچہ متذکرہ بالا ’’عرض داشت‘‘ پیش کرتے ہوئے انہیں خیال آتا ہے کہ ہم مسلمانوں نے نہ تو اپنی نسبتِ رسولؐ کا خیال رکھا اور نہ محمد ﷺ کے نام لیوا ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا۔ ہم مسلمان ہیں تو اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے؟ رسالتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر ہمارا ایمان ہے تو اس کے تقاضے کیا ہیں؟ —— افرادِ اُمّت‘ اس ضمن میں ایک عمومی غفلت کا شکار ہیں۔ اقبال کے لیے یہ چیز دلی اذیت کا باعث ہے۔ اس کیفیت کو وہ ذاتی حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ’’میں تو جب کبھی سوچتا ہوں‘ شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم پر فخر کریں؟ ہاں‘ جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کرلیں گے‘ جو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا‘ تو اس وقت اس قابل ہوسکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔‘‘

وہ نور کیا تھا جو آپ ﷺ نے ہمیں عطا کیا؟ اسلام کی نعمت‘ قرآن حکیم کی دولت‘ احکامِ الٰہی کا سرمایہ اور خدمتِ دین کا جذبہ —— یہ سب عشقِ رسول ﷺ کا تقاضا اور اس کے ثمرات ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: ’’اقبال کے تجربے میں تو عشقِ رسولؐ ہی ایسی نعمت ہے‘ جس کے ذریعے وہ اپنے تمام فکری مسائل حل کرسکتے تھے‘‘۔ اقبال کے نزدیک حُبِّ رسولؐ کے ذریعے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کا حصول ممکن ہے‘ بلکہ زمین و آسمان کی ساری عزتیں اور ساری نعمتیں صرف اسی طریقے سے مل سکتی ہیں۔ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا‘ لوح و قلم تیرے ہیں!

اور: ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ او ست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

’’جس شخص کو بھی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی نعمت مل جاتی ہے‘ وہ دریا و صحرا دونوں پر متصرف ہوجاتا ہے۔‘‘

لیکن جیسا کہ اکثر ابنائے زمانہ کا شیوہ ہے‘ انسان غفلت کا اسیر رہتا ہے‘ مکروہاتِ زمانہ ہی سے فرصت نہیں ملتی‘ یا ساری تگ و دو حصولِ دنیا کے لیے وقف رہتی ہے۔ دین کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ ہمارے گردوپیش بہت کم لوگ ہوں گے جنہیں تفہیمِ دین‘ خدمتِ اسلام یا اتباعِ رسول ﷺ کا حقیقی شعور ہو اور وہ ان فرائض کو ادا کرنے کا احساس بھی رکھتے ہوں۔ اقبال کو اس کا احساس تھا مگر انہیں ایک گونہ ندامت ہوتی تھی کہ وہ اتباعِ رسولؐ کے تقاضوں کو خاطر خواہ طریقے سے پورا نہیں کرسکے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ’’میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے‘ تو آج خدا کے رسولؐ کی مَیں کوئی خدمت کرسکتا۔ اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والدِ مکرم مجھے علومِ دینی ہی پڑھانا چاہتے تھے‘ تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے‘ کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی‘ تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہرحال جو کچھ خدا کے علم میں تھا‘ ہوا‘ اور مجھ سے بھی جو کچھ ہوسکا‘ مَیں نے کیا‘ لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا‘ اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا‘ اور زندگی تمام و کمال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔‘‘

اگرچہ جیسا اُوپر بھی ذکر ہوا‘ علّامہ اقبال نے آنحضور ﷺ پر بہ کثرت درود شریف پڑھنے کی تلقین کی ہے‘ مگر درجِ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشقِ رسول ﷺ ان کے نزدیک محض درود شریف پڑھنے اور محبت کے زبانی کلامی دعووں یا ان کی یاد میں آنسو بہانے تک محدود نہیں۔ عشقِ رسولؐ کا حقیقی تقاضا ’’نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت‘‘ ہے۔ یہ خدمتِ رسولؐ کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا احیا اور اس کا نفاذ —— یعنی خدمتِ رسولؐ‘ خدمتِ اسلام کے مترادف ہے۔ سید غلام میراں شاہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دعا کرتا ہوں خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت' ہمت' اثر' رسوخ اور دولت وعظمت کو حقائقِ اسلام کی نشر واشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضورِ رسالت مآب ﷺ کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔''

آں حضور ﷺ کی پوری زندگی باطل کے خلاف سراپا جہاد تھی۔ عصرِ حاضر میں بھی گوناگوں باطل نظریات' اسلام کے راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے خاتمے کے لیے کوشش وکاوش ایک طرح سے سُنّتِ نبویؐ ہے' خدمتِ رسولؐ بھی اور خدمتِ دین بھی۔

علّامہ اقبال کے نزدیک ایک مؤمن کی زندگی کا یہی مشن ہونا چاہیے۔ اپنی زندگی میں انہیں ''نازک زمانے میں اسلام کی حفاظت'' کی فکر برابر دامن گیر رہی اور وہ ''اسلام کی منتشر قوتوں کو جمع کر کے اس کے مستقبل کو محفوظ'' کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء کو مولوی صالح محمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' اس ملک ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے' اور اگر وقت پر موجودہ حالت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل' اس ملک میں کیا ہو جائے گا؟ آیندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا ہو جائے۔ آپ خواجہ صاحب کے دل میں بھی یہی تڑپ پیدا کریں کہ وہ اپنے دیگر احباب میں بھی یہی تحریک کریں' ورنہ ہم سب لوگ قیامت کے روز خدا اور رسولؐ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔''

اسی تسلسل میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت خدا تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے' اسے اسلام کی خدمت اور اقوام ومللِ اسلامیہ کے احیا و بیداری میں صرف کر دے۔''

یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے بارے میں علّامہ اقبال کا رجائی ذہن بہت واضح تھا۔ شاعری کے علاوہ خطوں میں بھی یہ رجائیت' اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ ایک صاحب نے خواب میں رسولِ پاک ﷺ کی زیارت کی تعبیر دریافت کی' اقبال انہیں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام مسلمانوں کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضورِ رسالت مآب ﷺ کی زیارت

خیر و برکت کا باعث ہے۔ گزشتہ دس پندرہ سال میں کئی لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے حضورِ رسالت مآب ﷺ کو جلالی رنگ میں یا سپاہیانہ لباس میں خواب میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ علامت احیائے اسلام کی ہے۔''

خود علّامہ اقبال اپنے تئیں احیائے اسلام کے لیے کاوش وکوشش کا فریضہ ادا کرنے کی سعی کرتے رہے' اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے خدمتِ اسلام اور خدمتِ رسول ﷺ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

محبتِ رسول ﷺ کے ضمن میں علّامہ اقبال کو اپنی ''نسبتِ حجازی'' بھی بہت عزیز تھی۔ وہ آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے خود کو ''اے عندلیبِ باغِ حجاز'' کہلوا کر فخر و مسرت اور روحانی لذت و سرشاری محسوس کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے حالات میں حجازِ مقدس کے سفر اور زیارتِ روضۂ رسولؐ کی تمنا کا بہ تکرار اظہار ملتا ہے۔ بارہا سفرِ حجاز کا ارادہ بھی کیا مگر بوجوہ یہ ارادہ بروئے کار نہ آسکا۔

آخری زمانے میں نبی پاک ﷺ کے لیے ان کا ذوق وشوق بڑھ گیا تھا۔ اس بنا پر آنحضور ﷺ کا ذکر آتے ہی وہ آبدیدہ ہو جاتے اور اکثر اوقات ان پر رقت طاری ہو جاتی۔ غلام رسول مہر کا بیان ہے:

''آپ ﷺ کا نام زبان پر آتے ہی چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ آپؐ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ اقبال کا عشق' بیان کا متحمل نہیں۔ ان کی تصانیف میں جو اشعار حضور ﷺ کے متعلق ہیں' ان میں سے ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے انہوں نے سنایا ہو اور اس پر بے اختیار اشک بار نہ ہوئے ہوں۔''

وفات سے کوئی آٹھ دس ماہ پہلے' علّامہ کے ایک دوست مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ نے حج بیت اللہ کا عزم کیا اور غالباً ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ جواباً انہیں لکھا کہ حج بیت اللہ کی آرزو تو گزشتہ دو تین سال سے میرے دل میں بھی ہے۔ خدا تعالیٰ ہر پہلو سے استطاعت عطا فرمائے' تو یہ آرزو پوری ہو' اور اگر آپ رفیقِ راہ ہوں تو مزید برکت کا باعث ہو۔ آپ ایسے باہمت جوان کے لیے تو یہ سفر قطعاً مشکل نہیں۔ ہمت تو میری بھی بلند ہے لیکن بدن عاجز و ناتواں ہے۔ کیا عجب کہ خدا تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور آپ کی معیت اس سفر میں نصیب کرے۔

یہی زمانہ تھا' جب وہ ''حضورِ رسالتؐ'' (جو اَب ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہیں) کے عنوان سے فارسی رباعیات لکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حج پر جانے کے لیے مختلف جہاز ران کمپنیوں سے خط کتابت بھی شروع کر دی تھی' گویا عملاً حالتِ سفر میں تھے۔ اسی زمانے کی رباعی ہے: ؎

بہ ایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

''اس بڑھاپے میں' مَیں مدینے کی طرف سرورِ عاشقی سے مست' گاتا چلا جا رہا ہوں اور میرا حال اُس پرندے کی طرح ہے جو صحرا میں شام ہوتے ہی اپنے آشیانے کی طرف لوٹنے کی فکر کرتا ہے۔''

اپنی بیماری کے سبب' اقبال کے لیے جسمانی طور پر سفر بہت مشکل ہو گیا تھا' چنانچہ عالَمِ خیال ہی میں وہ مدینہ طیبہ کی جانب رواں دواں رہے۔ اپنی علالت کے حوالے سے اسی زمانے کی حسبِ ذیل رباعی ان کے حسبِ حال تھی:

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رَو
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی
بہ پایش ریگِ ایں صحرا حریر است

''بوقتِ صبح میں نے اُونٹنی سے کہا کہ ذرا آہستہ چل' کیوں کہ سوار خستہ' بیمار اور بوڑھا ہے۔ اس پر وہ اس طرح مستانہ انداز میں قدم زن ہوئی گویا اس کے پاؤں کے نیچے پھیلی ہوئی ریگِ صحرا' ریت نہیں ریشم ہے۔''

مگر اثنائے سفر کی لذّت ایسی سرور انگیز اور وجد آفریں ہے کہ مسافر' ساربان کو راہِ دراز اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے تاکہ سفرِ شوق میں مسرت کے لمحات دراز تر ہو سکیں: ؎

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں انگیز تر کن!

بگیر اے ساربانِ راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن!

''اے ساربان! تو مسافر کے غم میں نشاط اور کیف کی آمیزش بڑھا دے اور اس کی آہ وزاری میں جنوں کا عنصر زیادہ کر دے۔ اے ساربان! لمبا راستہ اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو تیز تر کر دے۔''

علّامہ اقبال کو ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن کا سفر درپیش ہوا۔ واپسی پر مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کے لیے بیت المقدس گئے۔ وہاں سے مصر گئے اور پھر براہِ راست ہندوستان چلے آئے۔ اس پر بعض لوگوں نے سوال اٹھایا ہے کہ علّامہ نے عمرے اور روضۂ رسول ﷺ پر حاضری کے اس موقعے سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا! اس ضمن میں ''روزگارِ فقیر'' کے مؤلف فقیر سید وحیدالدین کی ایک روایت قابلِ غور ہے۔ [فقیر سید وحیدالدین کے والد فقیر سید نجم الدین علّامہ اقبال کے قریبی اور بے تکلف دوستوں میں شامل تھے] وہ بتاتے ہیں کہ علّامہ یورپ سے واپس آئے تو والد مرحوم اس موقعے پر ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدّت کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی' اس لیے بڑے تپاک سے ملے' اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا: ''اقبال! تم یورپ ہو آئے ہو' مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی' کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔'' یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی' یعنی چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے: ''فقیر! میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔''

انہی دنوں کسی شخص نے دریافت کیا کہ: فلسطین سے زیارتِ حرمین کے لیے جانا مشکل نہ تھا' پھر کیا امر مانع ہوا کہ آپ نے اس موقعے سے فائدہ نہ اٹھایا؟ جواباً علّامہ نے انہیں لکھا:

''مدینۃ النبی ﷺ کی زیارت کا قصد تھا' مگر میرے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ دنیوی مقاصد کے لیے سفر کرنے کے ضمن میں حرمِ نبویؐ کی زیارت کی جرأت کرنا سوئے ادب ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامی احباب سے وعدہ تھا کہ جب حرمِ نبویؐ کی زیارت کے لیے جاؤں گا تو وہ میرے ہم عناں ہوں گے۔ ان دونوں خیالوں نے مجھے

باز رکھا‘ ورنہ کچھ مشکل امر نہ تھا۔‘‘

بہ الفاظِ دیگر‘ انہیں دربارِ رسالت مآب ﷺ میں ضمنی طور پر حاضر ہونا اچھا نہ لگا۔ دراصل آنحضور ﷺ کے ہر اُمتی کی طرح علّامہ اقبال کو بھی اپنے گناہوں اور کوتاہیٔ فکر و عمل کا شدید احساس تھا۔ احساسِ ندامت کے سبب‘ وہ روضۂ رسولؐ پر حاضری سے گریزاں تھے‘ اور غالباً اسی لیے وہ ایک جگہ بارگاہِ خداوندی میں اس طرح التماس کرتے ہیں: ؎

تُو غنی از ہر دو عالَم‘ من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
وَر حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر!(۲)

’’(اے اللہ!) تُو سراپا غنی ہے (اور) میں تہی دست ہوں۔ روزِ حشر مجھے جواب دہی سے معاف رکھنا۔ لیکن اگر جواب دہی ناگزیر ہو تو پھر آں حضور ﷺ کی نظروں سے اوجھل ہو کر حساب لیجیو‘ تاکہ آپؐ کے سامنے میری رسوائی نہ ہو۔‘‘

بہرحال انہوں نے سفرِ حجاز کا ارادہ ترک نہیں کیا‘ مگر سوئے اتفاق سے‘ یورپ سے واپسی کے چند ماہ بعد وہ شدید طور پر علیل ہو گئے۔ انہیں وکالت ترک کرنی پڑی‘ معمولات متاثر ہو گئے‘ علاج معالجے کے لیے بار بار دہلی اور بھوپال جانا پڑا۔ بیماری کے نتیجے میں طرح طرح کے تفکّرات اور غم ہائے روزگار نے گھیر لیا‘ مگر اس عالَم میں بھی سرزمین مقدس کے لیے ان کے عزم و ارادے میں فرق نہیں آیا۔ ارادۂ سفر نہ صرف برقرار رہا‘ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفرِ حجاز کی آرزو تیز تر ہوتی گئی۔ اس آرزو نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ان کی دل بستگی میں اضافہ کر دیا تھا۔

دورِ آخر میں وہ رسول اکرم ﷺ سے محبت اور دل بستگی کی جس کیفیت سے گزر رہے تھے‘ اس کا ذکر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بڑے عمدہ الفاظ میں کیا ہے:

’’زندگی کے آخری ایّام میں پیمانۂ عشق اس طرح لبریز ہوا کہ مدینے کا نام آتے ہی اشکِ محبت بے ساختہ جاری ہو جاتے۔ وہ اپنے اس کمزور جسم کے ساتھ مدینۃ الرسولؐ میں حاضر نہ ہو سکے لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل‘ نیز اپنی قوتِ تخیل اور زورِ کلام کے ساتھ انہوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی اور ان کا طائرِ فکر ہمیشہ

اسی آشیانے یا آستانے پر منڈلاتا رہا۔‘‘

مدینۃ النبیؐ اقبال کے خوابوں کا شہر تھا۔ وہاں ان کی عزیز ترین ہستی محوِ استراحت تھی۔ ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ انہیں حجاز جانے کا موقع ملے تو سرزمین مدینہ ہی میں پیوندِ خاک ہو جائیں۔ یہ تمنا بھی آپؐ سے ایک تعلق خاطر کی دلیل‘ اور قلبی وابستگی کی ایک شکل ہے جس کا اظہار ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

ہست شانِ رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

’’آپؐ کی شانِ رحمت ایک زمانے کو نوازتی ہے۔ میری آرزو یہ ہے کہ مجھے موت آئے تو سرزمین حجاز میں۔‘‘

اقبال کے سفرِ حجاز کا خواب تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا اور نہ اُن کی ’’میرم در حجاز‘‘ کی تمنّا بروئے کار آ سکی۔ مگر ’’عرضِ حال مصنف بہ حضور رحمتٌ للعالمین ﷺ‘‘ (رموزِ بے خودی‘ ۱۹۱۸ء) کے ۲۰ سال بعد (۱۹۳۸ء میں) جب وہ اس عالَمِ فانی سے رخصت ہو کر عالَمِ جاودانی کو سدھارے اور عالم گیری مسجد لاہور کے سایۂ دیوار میں سپردِ خاک ہوئے‘ تو ان کی آرزو تھی: ؎

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش
مرقدے در سایۂ دیوار بخش!
تا بیاساید دلِ بے تابِ من
بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم‘ انجامم نگر!

’’میری قسمت کے ستارے کو بھی دیدۂ بیدار عطا فرمائیے اور اپنی دیوار کے سایے میں آسودۂ خاک ہونے کے لیے ذرا سی جگہ عطا فرمائیے تاکہ میرے دلِ بے تاب کو سکون نصیب ہو اور میری سیمابیت کو قرار آ جائے‘ اور مَیں فلک سے کہہ سکوں کہ دیکھو مجھے کیسے آرام نصیب ہوا۔ تُو میرا آغاز دیکھ چکا ہے‘ اب میرے انجام پر بھی نظر ڈال۔‘‘

اس آرزو کو ایک شکل میں تو یوں شرفِ قبولیت حاصل ہوا کہ وہ عالم گیری مسجد لاہور کی

دیوار تلے آسودۂ خاک ہیں جہاں ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء سے آج تک‘ نماز اور زیارتِ مسجد کے لیے آنے والے ہزاروں لاکھوں مسلمان‘ ان کے لیے مستقلاً دست بدعا رہتے ہیں —— یہ ’’رُتبہ بلند‘‘ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا اور ایسا اعزاز وافتخار عشقِ رسول ﷺ کا دعویٰ کرنے والوں میں سے کم ہی لوگوں کے حصے میں آیا ہوگا۔

حواشی

(۱) مذکورہ بالا دونوں اشعار‘ اقبال کے متداول کلام میں شامل نہیں ہیں‘ بلکہ دوسرے شعر سے متصل ومابعد حسبِ ذیل نہایت عمدہ شعر بھی اقبال نے‘ نمعلوم کیوں اپنے متداول کلام میں شامل نہیں کیا: ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

(۲) یہ رباعی‘ اقبال کے متداول کلام میں شامل نہیں ہے‘ اقبال نامہ (جدید یکجا اڈیشن‘ شائع کردہ: اقبال اکادمی پاکستان لاہور‘ ۲۰۰۵ء‘ ص ۲۵۶) میں موجود ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ مذکورہ رباعی اوائل ۱۹۳۷ء میں کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہوئی تو ڈیرہ غازی خاں کے ایک مدرس محمد رمضان عطائی نے‘ علّامہ سے تحریراً درخواست کی کہ یہ رباعی مجھے عطا کریں۔ علّامہ کا ظرف دیکھیے کہ انہوں نے عطائی صاحب کو لکھا: ’’شعر کسی کی ملکیت نہیں۔ آپ بلاتکلف وہ رباعی جو آپ کو پسند آگئی ہے‘ اپنے نام سے مشہور کریں‘ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے —— ‘‘ اور علّامہ واقعی اس بے مثال رباعی سے دست بردار ہوگئے اور اسے اپنے مجموعۂ کلام میں شامل کرنے کی ممانعت کر دی۔ تاہم راقم کی رائے میں‘ اب یہ رباعی ارمغانِ حجاز میں شامل کر لینی چاہیے۔

(تشکر: ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن‘ اپریل ۲۰۰۷ء)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اقبال کا فلسفۂ خودی

ڈاکٹر ابصار احمد

علامہ اقبال کے جملہ فلسفیانہ افکار میں تصورِ خودی کو ایک اہم اور مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس تصور سے دوسرے بہت سے تصورات ماخوذ ہیں' جو اس سے علمی اور عقلی طور پر منسلک ہیں۔ چنانچہ اقبال کے نظامِ فکر کے مرکز یعنی تصورِ خودی کو سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے جملہ افکار کی تفہیم کے لیے ایک کلید حاصل کر لیتے ہیں۔

اقبال چونکہ مادی جسم اور خودی (نفس یا روح) دونوں کی مستقل و علیحدہ ہستیوں کا اثبات کرتے ہیں اس لیے فلسفیانہ اعتبار سے ان کا شمار ثنوئیین کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان دو عناصر سے مرکب ہے: جسم اور نفس (یا خودی)۔ جسم روح کے لیے بمنزلہ ایک آلہ ہے جس کو ارادہ' احساس' علم وغیرہ میں فی نفسہٖ کچھ دخل نہیں جو کہ خودی کے افعال و وظائف ہیں۔ جدید فلسفہ میں روح اور جسم کے تضاد پر جس فلسفی نے سب سے زیادہ زور دیا وہ ڈیکارٹ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دو وجود بالکل مختلف النوع ہیں' جن کے درمیان کوئی شے مشترک نہیں۔ مادہ میں گو خواص بہت سے پائے جاتے ہیں مثلاً رنگ' وزن' بُو وغیرہ لیکن اس کا اصلی و طبعی خاصہ امتداد ہے یعنی وہ اَبعادِ ثلاثہ (طول' عرض' عمق) رکھتا ہے اور جگہ گھیرے ہوئے رہتا ہے۔ یہی وہ خاصہ ہے جس کا شائبہ تک رُوح یا نفس میں نہیں پایا جاتا' جس کا اصلی خاصہ فکر یعنی ذہنی افعال ہیں۔

فکرِ اقبال میں خودی سے مراد شعور کی وہ وحدت ہے جو خود شناس' خود آگاہ اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتی ہو۔ یہاں خودی کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے یا جس کی وجہ سے ایک انسان ہوش یا تمیز رکھتا ہے۔ انسان میں یہی غیر مرئی شے ہے جو خود شناس یا خود آگاہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ''مَیں'' کہتی ہے۔ اس لیے اقبال اس کو ''انا'' یا ''ایغو'' یا ''من'' بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے

انسان زندہ ہے اور جب مرتا ہے تو یہی اس کے جسم سے رخصت ہو جاتی ہے' اس لیے وہ اس کے لیے ''روح'' اور ''جان'' کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو ''زندگی'' اور ''حیات'' کے ناموں سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی لہٰذا ان معنوں میں کہ شعور زندگی ہے' ایک خاص سطح کا شعور بشکل حس حیوان میں بھی موجود ہے۔ البتہ حیوان کا شعور آزاد نہیں بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابلِ تغیر جبلتوں کے تحت کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا شعور جبلتوں سے آزاد ہو کر اور ان کی مخالفت میں بھی عمل کرتا ہے' اس لیے وہ خود شناس' خود شعور ہے اور اپنے مقاصد کو جانتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط جانتا اور محسوس کرتا ہے جبکہ انسان اپنے شعور کی وجہ سے نہ صرف جانتا' سوچتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اسے یہ اعلیٰ (Higher Order) شعور بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ جانتا' سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ہم انسان کے شعور کو خود شناس اور خود آگاہ کہتے ہیں۔ اسے صرف شعور نہیں بلکہ خود شناسی' خود شعوری یا خود آگاہی کہنا چاہیے۔ اقبال اسی فاعلی عنصر کو ''خودی'' کہتے ہیں۔

خود آگاہی' خودی کا ایک حیرت انگیز خاصہ ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو اور جِدّ و جُہد اسی خاصے کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے خودی اپنے آپ کو بغیر آنکھوں کے دیکھتی ہے اور بغیر کانوں کے سنتی ہے بلکہ اپنے آپ کو کسی حس کی مدد کے بغیر براہِ راست وجدانی طور پر پوری طرح سے جانتی ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ میں ہوں' کیونکہ میں سوچ رہا ہوں' وقوف حاصل کر رہا ہوں اور خوشی یا غم محسوس کر رہا ہوں' لیکن میری کوئی حس مجھے اپنے آپ کو جاننے میں مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ میں اپنی خودی کو بچشمِ سر نہیں دیکھ سکتا لیکن اس کے باوجود بغیر ان آنکھوں کے اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ میرے لیے اپنے آپ کا علم ان چیزوں کے علم سے بدرجہا زیادہ یقینی ہے جن کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ خارج کی دنیا کے متعلق ہمارا علم قیاسی ہے اور ہمارا قیاس حواس پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس کے تاثرات بدلنے سے' خواہ اس کا کوئی سبب خارج میں ہو یا نہ ہو' ہمارا علم بدل جاتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص کائنات کے متعلق تو کہہ سکتا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں' زمین اور مادی چیزیں درحقیقت موجود نہیں یا ان کی حیثیت ایک ایسے خواب یا وہم سے زیادہ نہیں جو خالق کائنات کی ہستی کے لیے ایک پردے کا کام دے رہا ہے' لیکن کوئی شخص خودی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک وہم ہے۔ خودی کا وجود محسوس

دنیا' خارجی دنیا یا مادّی دنیا کی چیز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے حواس اس کو جاننے کا وسیلہ نہیں بنتے۔ اگرچہ خودی نظروں سے اوجھل ہے' اس کے باوجود اس کا ہونا یقینی ہے۔ یہ ثبوت یا دلیل سے بے نیاز ہے' بلکہ تمام دُعاوی اور مسائل اور تمام براہین و دلائل اس کے ہونے پر مبنی ہیں۔

اس کے باوجود کہ خودی انسان کے جسدِ عنصری میں جاگزیں ہے جو سلسلۂ لیل و نہار کی پابندیوں سے گھرا ہوا ہے' وہ خود زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ وہ اپنے خیال کے ذریعہ سے اِدھر ماضی اور مستقبل کی انتہاؤں تک اور اُدھر کائنات کے دور دراز گوشوں تک آنِ واحد میں جا پہنچتی ہے۔ بقول اقبال: ؎

نقطۂ نوری کہ نامِ اُو خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

''نور وہ نقطہ ہے جس کا نام خودی ہے۔ ہماری خاک کے اندر زندگی کی ایک چنگاری ہے۔''

خودی ایک نور ہے لیکن مادی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اس کی مماثل ہو۔ اسی طرح خودی ایک قوت ہے لیکن مادی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے ساتھ اس کو مشابہت دی جا سکے۔ اقبال کے الفاظ میں خودی ''شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ وہ ایک لازوال حقیقت ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔'' اس کا ایک خاصّہ یہ ہے کہ وہ عمل اور خودنمائی کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ اس صفت کی رو سے خودی ایک مقصد کا تصوّر کرتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کا یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خود اظہاری یا ''وانمودن خویش'' سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اس بنا پر بعض ناقدین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبۂ خودنمائی یا ذوقِ استیلاء کے جائز و ناجائز استعمال میں فی نفسہٖ کوئی خاص خوبی ہے۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ دو باتوں سے ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں' برے بھی اور صحیح بھی ہوتے ہیں' غلط بھی۔ جِدّ و جُہد یا عمل سے خودی کو

مستقل اور مکمل اطمینان (جو اس کی پیہم ترقی اور ترفع کا ضامن ہے) اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب اس کا مقصد اس کی فطرت کے مطابق ہو۔ غلط مقصد کی پیروی سے خودی کو عارضی تسلی تو ہو جاتی ہے لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ثانیاً عمل یا جِدّ و جُہد احساسِ مدّعا کا لازمی نتیجہ ہے اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدّعا اچھا یا برا' صحیح یا غلط رکھنے پر مجبور ہے۔ غلط مدّعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدّعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتے ہیں جو خودی کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو اور لہٰذا صحیح ہو۔ ان کے نزدیک صحیح مدّعا لہٰذا صحیح عمل فقط مردِ مؤمن کا امتیاز ہے۔ گویا علامہ اقبال نے جس عملی جدّ و جُہد اور خودنمائی پر زور دیا ہے اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد یا مدّعا کو درست کریں۔ اسی کو وہ یقین یا ایمانِ محکم کہتے ہیں۔ اقبال نے خود اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ خودی سے ان کی مراد غرور یا تکبّر نہیں۔ چنانچہ ''اسرارِ خودی'' کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں ہوا' جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا یقینِ ذات ہے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''جب میں نفیٔ خودی کی مذمت کرتا ہوں تو میرا مطلب اس سے اخلاقی معنوں میں ایثار یا نفس کشی کی مذمت نہیں ہوتا۔ نفیٔ خودی کی مذمت سے میں ایسے الفاظ کی مذمت کرتا ہوں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ''میں'' کو ایک مابعد الطبیعیاتی قوت کی حیثیت سے مٹا دیا جائے' کیونکہ اسے مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزاء بکھر جائیں اور وہ حیات بعد الموت کے قابل نہ رہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اسلامی تصوف کا نصب العین خودی کو مٹانا نہیں۔ اسلامی تصوف کا نصب العین ایک ایسا مقام ہے جو فنا کے مقام سے بھی آگے ہے' یعنی مقامِ بقا جو میرے نقطہ نظر سے اثباتِ خودی کا بلند ترین مقام ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ ''لعل کی طرح سخت ہو جاؤ'' تو میری مراد نطشے کی طرح یہ نہیں ہوتی کہ بے رحم اور بے درد ہو جاؤ بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خودی کے عناصر کو مجتمع کرو تا کہ وہ بعد از مرگ زندہ رہنے کے لیے فنا کا مقابلہ کر سکے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے خودی کا مطلب ہے خود اعتمادی' خود داری' اپنی ذات پر بھروسا' حفاظتِ ذات بلکہ اپنے آپ کو غالب

کرنے کی کوشش جبکہ ایسا کرنا زندگی کے مقاصد کے لیے اور صداقت‘ انصاف اور فرض کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت کے لیے ضروری ہو۔ اس قسم کا کردار میرے خیال میں اخلاقی ہے کیونکہ وہ خودی کو اپنے قویٰ مجتمع کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح تحلیل اور انتشار کی قوتوں کے خلاف خودی کو سخت کر دیتا ہے۔ عملی طور پر مابعد الطبیعیاتی ایغو دو بڑے حقوق کا علم بردار ہے۔ اوّل زندہ رہنے کا حق اور دوم آزاد رہنے کا حق‘ جیسا کہ خداوندی قانون نے مقرر کیا ہو۔‘‘

خودی کے وظائف میں سے ایک وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہماری ذہنی حالتوں (mental states) میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

’’خودی ذہنی حالتوں کی ایک وحدت کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ ذہنی حالتیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتیں‘ وہ ایک دوسرے میں شامل ہوتی ہیں اور حقیقتاً ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ وہ ایک مرکب کل کی جسے ہم ذہن کہتے ہیں‘ بدلی ہوئی کیفیتوں کے طور پر ہوتی ہیں۔ آپس میں تعلق رکھنے والی ان حالتوں کی وحدت ایک مخصوص طرز کی وحدت ہے۔ یہ ایک مادی شے کی وحدت سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے۔‘‘

خودی کوئی ایسی چیز نہیں جو مکاں (space) میں کہیں پڑی ہوئی ہو بلکہ اس کی اصل ایک فعلیت ہے۔ وہ انسان کے فکر و عمل کی ایک قوت ہے جو ایک مقصد اختیار کرتی ہے اور جس کا مقصد انسان کے افعال کو مربوط کرنا ہے۔ یہ انسان کی وہی اندرونی قوت ہے جو فیصلے کرتی ہے‘ اندازے قائم کرتی ہے اور رجحاناتِ فکر و عمل طے کرتی ہے۔ اس موضوع پر قرآن کا ارشاد واضح ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵﴾ (بنی اسرائیل)

’’یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں‘ کہیے روح خدا کے حکم کی پیداوار ہے‘ اور تم لوگ کم ہی علم دیے گئے ہو۔‘‘

لفظ ’’امر‘‘ کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن نے خلق اور امر کے درمیان جو فرق کیا ہے‘ ہم اس کی طرف رجوع کریں۔ خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا اور امر کے معنی ہیں حکم کرنا‘ جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ﴾ (الاعراف: ۵۴) ’’سن لو! اسی کے لیے

ہے پیدا کرنا بھی اور حکم کرنا بھی۔‘‘ اس آیت کی رو سے روح کی بنیادی فطرت حکم ہے‘ کیونکہ وہ خدا کی حکمران قوت سے پیدا ہوتا ہے‘ اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ کس طرح خدا کا امر ان وحدتوں کی شکل میں ظہور پزیر ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک ایک روح یا خودی ہے۔ ضمیر متکلم جو لفظ رَبِّیْ میں ہے‘ خودی کی فطرت اور ماہیت پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ روح کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو منفرد اور معیّن ہے۔ اپنے تمام تر داخلی اختلافات کے باوجود مغرب کے بعض حکماء اور فلاسفہ نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کا شعور یا اس کی خودی فقط مادہ کی ایک ترقی یافتہ حالت کا وصف ہے۔ جب مادہ کے ذرات ترقی کر کے حیوان کے دماغ کی صورت میں ایک خاص قسم کی طبیعیاتی ترتیب اور کیمیائی ترکیب حاصل کر لیتے ہیں تو اس میں شعور کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے‘ اور جب یہ ترتیب اور ترکیب ختم ہو جاتی ہے تو یہ جوہر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال ایسے حکماء مادیین سے یکسر اختلاف کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں وہ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہو سکتی ہے‘ لہٰذا وہ ہمیشہ موت کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ اقبال مادّہ پرست حکماء کے پیرو سے خطاب کر کے کہتے ہیں: ؎

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تُو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی!

اقبال کے نزدیک خودی مادّے کی کسی ترقی یافتہ حالت کا نام نہیں بلکہ مادّے کی ہر حالت کا وجود اس کا مرہونِ منّت ہے۔ انسانی خودی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ عمل میں اپنا اظہار پانے کے لیے ہر وقت بے تاب رہتا ہے۔ یہ جذبہ اس قدر طاقتور ہے کہ اگر یہ بھٹک کر کسی اور خواہش کو اپنا مقصود نہ بنا لے تو انسان کی تمام حیوانی قسم کی خواہشات کو اپنا تابع رکھتا ہے اور اس کو اپنی غرض کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا انسان فقط خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے‘ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگر یہ جذبہ ختم ہو جائے تو انسان بھی باقی نہ رہے: ؎

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو مَیں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے‘ یہی طغیانِ مشتاقی!

خدا کی معرفت اور اس سے ربط کی خواہش خودی کی اپنی خواہش ہے جبکہ انسان کی حیوانی

خواہشات خودی کی اپنی خواہشات نہیں بلکہ انسان کے جسم کی خواہشات ہیں۔ جسم خودی کا خدمت گزار ہے‘ اس کا حاکم نہیں۔ وہ شخص جو اپنے جسم کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیتا ہے وہ اپنی خودی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرے‘ اور نشوونما پا کر مکمل ہو جائے۔ لہٰذا وہ اپنی اس غیر دانش مندانہ روش کے شدید نقصانات کو اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں جھیلتا ہے۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اقبال نے اپنے تصوّرات فلسفۂ مغرب سے مستعار لیے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کی نگاہ میں اقبال پر لکھنے یا ریسرچ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے ماخذ کو فکرِ مغرب میں تلاش کیا جائے۔ دراصل یہ لوگ مادّی علوم میں مغرب کے تفوق سے مرعوب ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان انسانی علوم میں بھی جن کو اقبال نے اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا ہے‘ کہاں مشرق کا کوئی آدمی مغرب سے الگ راہیں پیدا کر سکتا ہے! حالانکہ حکمائے مغرب کو خود اعتراف ہے کہ وہ انسانی علوم میں کوئی ترقی نہیں کر سکے۔ یہ لوگ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ تمام حکیمانہ افکار کسی نہ کسی تصوّرِ حقیقت کے اجزاء و عناصر ہوتے ہیں‘ اس کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں اور اس کے ارد گرد ایک نظامِ حکمت بناتے ہیں۔ اقبال کا تصوّرِ حقیقتِ اعلیٰ اسلام کا خدا ہے‘ جس کے لیے وہ ’’لامتناہی خودی‘‘ یا ’’انائے کبیر‘‘ (Ultimate Ego) کی فلسفیانہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں جبکہ مغرب میں ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جس کا تصوّرِ حقیقت اسلام کا خدا ہو‘ لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ کسی مغربی حکیم کا کوئی تصوّر اپنی اصل حالت میں اقبال کے کام آ سکے۔ اس میں شک نہیں کہ خودی (self) کی فلسفیانہ اصطلاح حکمائے مغرب نے بالعموم استعمال کی ہے لیکن ان میں کسی کے ہاں اس اصطلاح کے معنی وہ نہیں لیے گئے جو اقبال نے لیے ہیں اور جس کے منطقی یا عقلی مضمرات یا نتائج اسلام کے خدا کی صفات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر اقبال کے فلسفے کا مرکزی تصوّر یعنی تصوّرِ خودی اس کا اپنا تصوّر ہے جو کسی اور فلسفی کے ہاں موجود نہیں تو پھر ضروری ہے کہ اقبال کے اس مرکزی تصوّر کے مضمرات اور متضمنات بھی اس کے اپنے ہوں‘ اگرچہ ان میں سے بعض ایسے ہوں جو کچھ مغربی فلسفیوں کے تصوّرات سے مشابہت رکھتے ہوں اور بظاہر ان سے مستعار نظر آتے ہوں۔

میں یہاں مختصراً صرف ایک دو فلسفیانہ نظریات پر بحث کروں گا جو خودی یا self کے ایک غیر حسّی یا مابعد الطبیعیاتی حقیقت ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ سب سے پہلے منطقی اثباتیت

کو لیجیے۔ حکمائے مغرب کا یہ غیر عقلی عقیدہ کہ صداقت صرف وہی ہے جسے ہمارے حواس براہِ راست دریافت کر سکیں‘ جن غلط فلسفوں کو وجود میں لانے کا باعث ہوا ہے ان میں سے ایک منطقی اثباتیت (Logical Positivism) ہے۔ پروفیسر کارناپ‘ اے جے ائیر اور وزڈم وغیرہ اس کے مشہور پیش کنندگان میں سے ہیں۔ اس فلسفے کے مطابق سائنس یعنی حسی عمل ہی واقعی اور حقیقی (factual) علم ہے جبکہ تمام روایتی اور مابعد الطبیعیاتی عقائد کو بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ علم کی آخری بنیاد ذاتی وجدانی احساس پر نہیں بلکہ حسّی تجربہ اور تصدیق پر ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت میں تین دعوے کیے گئے ہیں:

د۱: حسی علم ہی حقیقی علم ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی علم حقیقی علم نہیں۔

د۲: مابعد الطبیعیاتی عقائد بے معنی ہیں۔

د۳: علم کی آخری بنیاد تجربہ اور تصدیق پر ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منطقی اثباتیت کے حکماء کو یہ کیسے علم ہوا کہ حسی علم ہی واقعی علم ہے‘ مابعد الطبیعیاتی عقائد بے معنی ہیں اور علم کی آخری بنیاد تجربہ اور تصدیق ہے جبکہ اس علم کو ان فلاسفہ میں سے کسی نے بھی سائنسی طریق یا تجربہ سے حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اس کو تصدیق کے عمل سے گزارا ہے اور نہ ہی کوئی اس کو کسی اور بنا پر حواس کے تجربات میں سے شمار کر سکتا ہے؟ لہٰذا ان دعووں میں سے ہر ایک خود مابعد الطبیعیاتی عقیدہ ہے اور ان فلاسفہ کے اپنے قول کے مطابق بے معنی ہے۔ منطقی اثباتیت کے قائلین مابعد الطبیعیاتی عقائد کو بے معنی سمجھتے ہیں لیکن خود ایسے عقائد پر ایمان رکھتے ہیں۔ مزید برآں تجربہ اور تصدیق جسے وہ علم کی بنیاد قرار دیتے ہیں‘ آخر کسی ذی شعور و عقل ہستی کا تجربہ ہو گا لیکن منطقی اثباتیت اسی غیر حسی فاعل کا انکار کرتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ منطقی اثباتیت اس بات کی عمدہ مثال ہے کہ جو علم اور نظریہ بھی خودی اور اس کے اوصاف و خواص کو نظر انداز کر کے لکھا جائے گا‘ ضروری ہے کہ اس میں ایک بنیادی علمی تصوّر کے محذوف ہو جانے کی وجہ سے طرح طرح کی استدلالی اور منطقی ناہمواریاں اور علمی خامیاں پیدا ہو جائیں۔ فی الحقیقت خودی ہی ہر علم اور سائنس کی ابتدا اور انتہا ہے۔

ایک اور فلسفیانہ مکتب خیال جو آج کل برطانیہ اور امریکہ میں مقبول عام ہے‘ منطقی کرداریت (Logical Bchaviourism) کا نظریہ ہے۔ وٹگنسٹائن‘ گلبرٹ رائل اور بعض

دوسرے مفکرین اس نظریے کے سرخیل ہیں۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ہمارے عام بول چال کے الفاظ اور جملوں میں وہ الفاظ جو نفسیاتی افعال کو بیان کرتے ہیں' باطنی یا انفرادی افعال و کیفیات کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ افعال کے صرف ظاہری (public) اور معروضی پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں' اس لیے صرف وہی حقیقی ہیں۔ داخلی کیفیات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر وہ خودی یا self کا انکار کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نظریے کی خامی ان کے اپنے طرزِ استدلال یعنی لسانی تحلیل کے ذریعے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک جملہ لیجیے: ''خالد لاہور آ گیا اور اس نے وہاں ایک لیکچر سنا'' ایک بامعنی جملہ ہے۔ اگر جملے کے دوسرے حصے میں ضمیر ''اس'' کی بجائے ہم کہیں کہ ''خالد لاہور آ گیا اور اس کے جسم یا کانوں نے ایک لیکچر سنا'' تو ہمیں یہ از حد غیر مانوس معلوم ہوگا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ضمیر (pronoun) ''اس'' یا ''وہ'' صرف کسی فرد کے جسم یا جسمانی اعضاء کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ اس متشکل شخصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو جسم اور خودی' نفس یا روح دونوں کے مرکب سے عبارت ہے۔

(یہ مقالہ پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۴ تا ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳ء میں پڑھا گیا۔)

❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

اُمّتِ مُسلمہ کی زبوں حالی کا علاج

حافظ محمد اسد ☆

اُمّتِ مُسلمہ پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب اُس کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزاں و ترساں ہوا کرتا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمان ماں‘ بہن‘ بیٹی کی عزت کا محافظ تھا بلکہ غیر مسلم بھی اپنی بچیوں کی چادر کے تحفظ کے لیے اسی کی طرف دیکھتے تھے۔ مغرب کے کنارے پوری شان و شوکت کے ساتھ صدیوں سے کھڑا جبل الطارق آج بھی ہمیں وہ ایمان افروز داستان سنا رہا ہے جب ایک عیسائی سردار مسلمانوں کے سالارِ اعلیٰ موسیٰ بن نصیر کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ہم نے سنا ہے کہ اہل اسلام عورتوں کی عزت کے محافظ ہوتے ہیں‘ وہ خواتین کے تقدس کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں‘ غیر عورت کو دیکھتے ہی احترام سے سر جھکا لیتے ہیں۔ مسلمان معاشرے میں ہر عورت ایک عفت مآب‘ قابلِ احترام‘ عزّت و وقار کی حامل اور قابلِ تحفظ ہوتی ہے۔ اس کی طرف غلط نگاہ اٹھانے کو شرم ناک جرم سمجھا جاتا ہے۔ اے امیر! ہمارا بادشاہ اس قدر اوباش اور بے ضمیر ہو چکا ہے کہ خود ہماری بیٹیاں بھی اب اس کی ہوس ناک نگاہوں سے محفوظ اور مامون نہیں۔ خدارا! ہمیں اس سے نجات دلا دیں اور اندلس پر اسلام کا پرچم لہرا کر ہماری بیٹیوں کے دوپٹے کی لاج رکھ لیں۔ پھر طارق بن زیاد نام کا وہ نوجوان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھا اور اندلس ہی پر نہیں تاریخ کے صفحات پر بھی ایسا چھایا کہ آج بھی ان علاقوں کے غیر مسلم اس کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا عروج تھا‘ بلندی تھی‘ اوجِ کمال تھا!

اس کے برعکس آج روشن خیالی کے دور کی پستی بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اخبارات کا مطالعہ کریں تو ایسی ایسی خبریں نظروں سے گزریں گی کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مسلمان نوجوان سے اس کی گلی محلے ہی کی مسلمان ماں‘ بہن‘ بیٹی محفوظ نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا تھا وہ سراپا شیطنت کیسے بن گیا! وہ جو غیرت

☆ استاذ قرآن اکیڈمی یٰسین آباد‘ کراچی

وحمیت کا استعارہ تھا‘ بے غیرتی اور بے حمیتی میں جانوروں کو بھی کیسے شرمانے لگا! جو رات کے اندھیرے میں بھی اپنے ربّ کے عذاب سے ڈرتا تھا‘ جس کے آنسوؤں سے سجدے کی جگہ تر ہوتی تھی‘ جو خلوت وجلوت میں غلط کام کرتے ہوئے کانپ جاتا تھا‘ جو ’’شاب نشأ فی عبادۃ اللہ تعالیٰ‘‘ کا صحیح اور سچا مصداق تھا‘ جو اپنوں کے لیے باعث اطمینان اور قابلِ فخر تھا‘ جو دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا تن من دھن اسلام اور مسلمانوں پر لٹانے والا تھا‘ وہ اتنے زوال میں کیسے چلا گیا‘ اتنی پستی کا شکار کیسے ہو گیا!

ہاں! ہم سے بھول ہوئی ہے اور بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ ہم نے بحیثیت قوم غلطی کی ہے اور بہت خوف ناک غلطی کی ہے۔ ہم نے تباہی کو دعوت دی ہے‘ اور بڑی پُرزور دعوت دی ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

ہم نے اپنے نوجوان کو جس راستے پر لگایا‘ جس راہ پر چلایا اُس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا اور یہی انجام بد ہمیں آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ ہم نے اُسے کبھی مخلوط تعلیم کے نام پر‘ کبھی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے نام پر‘ کبھی آزادی اور ترقی کے نام پر جو کچھ دیا آج وہ قوم کو وہی واپس لوٹا رہا ہے تو اب ہمیں برا کیوں لگتا ہے! گندم بوئیں گے تو گندم ہی کاٹیں گے۔ ہمیں لوٹنا ہوگا۔ اپنے نوجوان کو بچانا ہوگا۔ آنے والی نسلوں کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔ انہیں بتانا ہوگا کہ مسلمانوں کی تاریخ ایسے پُرعزم اور پُرہمت مجاہدین کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے اپنا لہو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی راہ میں بہا کر مسلمانوں کو سرنگوں ہونے سے بچا لیا۔ ہمیں پھر سے ایسی مائیں اُمّت کو دینی ہوں گی جن کی گود میں محمد بن قاسم اور صلاح الدین ایوبی جیسے فرزند ارجمند پیدا ہوں۔ یہ کیسے ہوگا؟ کس طرح ہوگا؟ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وہی دیرینہ بیماری‘ وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!
نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی!

اسلام کی آمد سے قبل جس بیماری نے انسانوں کے دل کو زنگ آلود کر دیا تھا‘ توحید کا نظریہ ماند پڑ چکا تھا‘ ایمان بالآخرۃ سے لوگ بے بہرہ ہو چکے تھے‘ تقریباً وہی صورت حال آج پھر عود کر آئی ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت بھی تقریباً یہی ہے۔ عقیدۂ آخرت زبان پر تو ہے لیکن دل اس سے تقریباً بے بہرہ ہیں۔ اللہ ربّ العزت کے سامنے اعمال کی جواب دہی کا تصور ذہن میں غالب ہو تو ساری برائیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ اس لیے علامہ فرماتے ہیں کہ ساری بدعملیوں کا علاج اسی شَرَابًا طَهُورًا کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات پر عمل اور تبلیغ ہی سے معاشرہ میں بہتری آ سکتی ہے‘ خصوصاً وہ شریعت جو نبی آخر الزماں جناب رسالت مآب حضرت محمد ﷺ دنیا میں لے کر تشریف لائے۔ علامہ اسی کو بیماری کی دوا سے تشبیہ دے رہے ہیں‘ یعنی وہی آبِ حیات جو دل میں فرحت و انبساط پیدا کرتا ہے‘ آج بھی اسی کے ذریعہ دنیا کے تمام روگ اور بیماریاں دور ہو سکتی ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور ذریعہ اصلاح کا نہیں ہے۔ مسلمان قوم کو فکری حوصلہ ملے تو ان شاء اللہ اسی مٹی سے لعل و گہر پیدا ہو سکتے ہیں اور مسلمان قوم اپنی عظمتِ رفتہ حاصل کر سکتی ہے۔

آج دنیا میں مسلمان ہی وہ واحد خوش قسمت قوم ہیں جن کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام بالکل محفوظ‘ تحریفات سے پاک اور ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں موجود ہے جن میں وہ رسول اکرم ﷺ پر اترا تھا۔ ایک اور زاویہ سے دیکھیں تو آج دنیا میں مسلمان ہی وہ بدقسمت لوگ ہیں جو اپنے پاس جامع ترین دستورِ الٰہی رکھنے کے باوجود اس کی خیرات و برکات اور بے پایاں نعمتوں سے محروم ہیں۔ قرآن حکیم انہیں اس لیے مرحمت ہوا تھا کہ وہ اسے پڑھیں اور سمجھیں‘ اس کے مطابق عمل کریں اور اللہ کی زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کریں۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ جب انہوں نے کتابِ الٰہی کی ہدایتوں پر عمل کیا تو اس نے انہیں دنیا کا پیشوا اور امام بنا دیا۔

حضرت عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی امیر مکہ حضرت نافع بن عبدالحارث رضی اللہ عنہ سے مقام عسفان میں ملاقات ہوئی تو ان سے دریافت فرمایا: اہلِ مکہ پر اپنی جگہ کسے امیر مقرر کر کے آئے ہو؟ حضرت نافعؓ نے عرض کیا: ابن ابزیٰ کو! فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ ابن ابزیٰ کون ہے؟ نافع نے کہا: میرے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے اہلِ مکہ پر ایک غلام کو حاکم و امیر بنا دیا؟

نافع بولے: ہاں‘ میں نے ایسا ہی کیا ہے‘ کیوں کہ وہ قرآن کا قاری اور فرائض و علومِ قرآنی کا عالم ہے۔ یہ سن کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی ﷺ کا یہ ارشاد بالکل برحق ہے کہ:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِينَ)) (صحیح مسلم: ۱۸۹۷)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا حاصل یہی ہے کہ قرآنِ عزیز انسان کے پاس صرف اس لیے نہیں آیا کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر دم کرتا رہے‘ بلکہ قرآن تو سراسر خیر و برکات کا مجموعہ اور سعادت و کرامت کا سرچشمہ ہے۔ لہٰذا جو قوم اس نورِ مبین کے ہوتے ہوئے بھی ذلت و نکبت کی تاریکیوں میں سرگشتہ و پریشان ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کتابِ الٰہی کے ساتھ بے اعتنائی کر رہی ہے۔ موجودہ محکومیت و مغلوبیت سے نکلنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ مسلمان اجتماعی و انفرادی طور پر اللہ کی اس رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ ہمارے مرض کا صرف یہی علاج ہے۔ وائے محرومی کہ ہم نے انعام یافتہ بزرگوں کا راستہ چھوڑ کر گمراہ اور مبغوض قوموں کی روش اختیار کر لی ہے۔ وضع قطع‘ صورت و سیرت‘ تعلیم و تربیت‘ تہذیب و تمدن‘ اعمال و اخلاق‘ اقتصادی و معاشی معاملات اور حکومت و سلطنت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارا رُخ قرآن اور صاحبِ قرآن سے ہٹا ہوا ہے۔ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ ''منہ میرا کعبہ شریف کی طرف'' لیکن رفتار کی سمت لندن‘ پیرس‘ ماسکو‘ برلن اور نیویارک ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے علوم و تواریخ سے بے بہرہ‘ اپنے یقینات اور ایمانیات سے لاتعلق ہو کر دوسری قوم کے رسوم و رواج‘ خصائل اور تہذیب و معاشرت کو اپنا لیتی ہے تو وہ فی الحقیقت دوسری قوم بن جاتی ہے۔ سچ فرمایا محمد عربی ﷺ نے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (سنن ابی داؤد: ۴۰۳۱)

''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ انہی میں سے ہے۔''

آج مسلم قوم اسی زبوں حالی کا شکار ہے۔ عصرِ حاضر کی ایجاد و اختراع‘ دولت و ثروت اور ظاہری چمک دمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہیں۔ اعلانِ باری تعالیٰ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ.....﴾ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہے اور وہ تہذیبِ مغرب کو اختیار کرتی جا رہی ہے۔ وہی عریانی و آوارگی‘ نفس پرستی و ہوس ناکی جس نے مغرب کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے‘ ہم اسی طوقِ لعنت کو گلے میں آویزاں کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔

ہمارے باہمی خلفشار اور تنازعات نے ہمارے مستقر پر حملہ کیا اور ہمیں برباد کر کے رکھ دیا‘ لیکن یاد رکھیں کہ ہم ہی اس دینِ متین کے محافظ اور نبی اُمّی ﷺ کی تعلیمات کے مبلغ ہیں۔ اُمّتِ مُسلمہ کے وجود و بقا کا مدار دین کے تحفظ پر ہے۔ امام مالک بن انسؒ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ)) (رواہ فی الموطا)

’’میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں‘ جب تک تم ان دونوں چیزوں کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے کبھی گمراہی تمہارا پیچھا نہیں کر سکتی (اور وہ دو چیزیں ہیں) اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سُنّت۔‘‘

جب تک ہم احکاماتِ الٰہیہ اور سُنّتِ نبویہ پر گامزن رہیں گے‘ زیغ وضلالت سے محفوظ رہیں گے۔ آج پھر سے دین کے تحفظ کے لیے ایک ہو کر کھڑے ہونا ضروری ہے۔ اپنی غفلت کی نیند سے بیدار ہونا لازم ہے۔ یہ کسی ایک مدرسہ یا جامعہ کا مسئلہ نہیں ہے‘ بلکہ علومِ ایمانی کے تحفظ کا معاملہ ہے۔ آج پوری انسانیت گمراہی کی طرف جا رہی ہے اور بداخلاقی کی دلدل میں ڈوب رہی ہے۔ ایسے نازک وقت میں ڈوبتی کشتی کا ملاح بھی ہم ہی ہیں‘ اور اُمّت کی شکستہ حالی کو خوش حالی میں تبدیل کرنا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ظلمتوں کے اس اندھیرے کی چادر کو چاک کرنا ہوگا۔ ہمت کا وہ کوہِ گراں بننا ہوگا جس پر دنیا کی کوئی شہنشاہیت غالب نہ آ سکے۔

یہ کس قدر محرومی کی بات ہے کہ جس قوم کے پاس ایک مستقل نظام‘ فکر و عمل اور ایک مکمل تہذیب و تمدن ہے‘ وہ اپنے اس زریں و جامع ترین نظام کو چھوڑ کر غیروں کے پس خوردہ کے لیے بے تاب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے زاویہ نگاہ کو بدلا جائے اور قرآن کریم کو اپنا ہادی و راہنما مان کر اس کی تعلیمات سے اپنی زندگی کو مزین کیا جائے اور اس کے عطا کردہ نظامِ عدل و قسط کو اجتماعی طور پر نافذ اور قائم کرنے کی عملی جِدّ و جُہد کی جائے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں پھر سے وہ کھویا ہوا مقام عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیت
اعتدال اور میانہ روی

مولانا عبدالمتین

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمّت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔''

اس آیت میں اللہ ربّ العزت اُمّتِ محمدیہ ﷺ کے حوالے سے ایک خاص بات بیان فرماتے ہیں۔ قرآن کریم کے مذکورہ مضمون کے سیاق وسباق میں اُمّتِ مُسلمہ کے حوالے سے یہ باتیں ذکر ہوئی ہیں:

(۱) اُمّت کے افراد یعنی اُمّتِ مُسلمہ

(۲) اُمّت کا مرکز یعنی بیت اللہ

(۳) اُمّت کے نبی یعنی نبی کریم محمد ﷺ

اس تحریر کا موضوع اُمّتِ محمدیہ کے افراد سے متعلق ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیت

مذکورہ بالا آیت میں اللہ ربّ العزت اُمّتِ محمدیہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ایک خاص اصطلاح ذکر فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہیں ''اُمّتِ وسط'' بنایا ہے۔ عربی میں ''وسط'' اعتدال، میانہ روی اور بیچ کے راستے کو کہتے ہیں۔

اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ جو چیز درمیان میں ہوتی ہے وہ زیادہ اچھی لگتی ہے اور زیادہ آویزاں ہوتی ہے۔ اسی طرح جب کسی مجلس میں اسٹیج بنتا ہے تو بالکل بیچ میں بنتا ہے اور صدرِ مجلس

کی کرسی اسٹیج کے بالکل بیچ میں لگائی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس مجلس میں سب سے معزز ہیں۔ اللہ ربّ العزت فرماتے ہیں کہ تمہاری بھی خصوصیت ایسی ہی ہے کہ تم افراط وتفریط کا شکار نہیں ہو۔ نہ تم حد سے آگے بڑھنے والے ہو اور نہ حد سے گرنے والے ہو۔ اس لیے کہ ہم نے تمہیں ایک معتدل اور درمیانی اُمّت بنایا جو اعتدال پر اور انصاف پر قائم رہنے والی ہے تاکہ روزِ محشر تم لوگوں پر گواہ بن سکو اور نبی آخر الزماں ﷺ تم پر گواہ بن سکیں۔ یہ تمہاری سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

روزِ محشر اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیت

رسول اللہ ﷺ کے دنیا میں آنے سے پہلے بہت سی اُمتیں رہی ہیں لیکن اللہ ربّ العزت نے کسی اُمّت اور کسی قوم کو یہ اعزاز نہیں بخشا جو اُمّتِ محمدیہ ﷺ کو بخشا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ روزِ محشر جب تمام لوگ جمع ہوں گے تو کُل ایک سو بیس صفیں قائم ہوں گی جن میں سے ۸۰ صفیں اُمّتِ محمدیہ ﷺ کی ہوں گی اور بقیہ ۴۰ دیگر اُمتوں کی۔

پچھلی اُمتوں میں یہ خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ بات کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے یا پھر بہت ہی زیادہ معمولی بنا دیتے۔ اُمّتِ محمدیہ ﷺ کی یہی خصوصیت بتائی گئی کہ یہ باتوں کے اعتدال کو جانتی ہے اور اسے دین وشریعت کے مزاج کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس اُمّت کو آخری اور سب سے زیادہ فضیلت والی اُمّت قرار دیا جا رہا ہے۔

فضیلت وانعام کا یہ سلسلہ اللہ ربّ العزت نے بنی اسرائیل کو بھی عطا فرمایا لیکن انہوں نے افراط وتفریط سے کام لیا اور بالآخر بہت سی خرافات میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں تک کہ سیدنا عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے کر توحید تک کا انکار کر دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، نعوذ باللہ، اللہ کا بیٹا مان لیا۔ ایک طرف یہ غلطی کر رہے ہیں کہ نبیوں کو خدا کا مقام دے رہے ہیں اور دوسری طرف معجزات کا انکار کر رہے ہیں۔ گویا ان میں درمیانہ پن نہیں رہا کہ ایک طرف اتنا اونچا مقام دے رہے ہیں کہ بات کو آسمان تک پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف نبی ان کے سامنے معجزات دکھاتے ہیں تو وہ انکار کر دیتے ہیں۔

صحابہ کا مزاج اعتدال سے بھرپور نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارے پر اپنی جان و مال قربان کرنے کو تیار ہیں، لیکن کبھی کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں رسولِ مکرم ﷺ کو،

نعوذ باللہ خدا کا درجہ دوں گا' بلکہ کہتا یہی ہے: أَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اعتدال کی تربیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ اِلٰى بُيُوتِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْاَلُونَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ، فَلَمَّا اخبروا كَاَنَّهُمْ تقالُّوها، فَقَالُوا: وَاَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَاَخَّرَ' قَالَ اَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنا فَاِنِّي اُصَلِّي اللَّيْل ابدًا، وَقَالَ آخَرُ: اَنا اَصُومُ الدَّهْرَ وَلَا اُفْطِرُ، وَقَالَ آخَرُ: اَنَا اَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا اَتَزَوَّجُ اَبَدًا، فَجَاءَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِلَيْهِمْ فَقَالَ: ((اَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّي لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهُ، لٰكِنِّي اَصُومُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّي وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّيْ)) (مشکوٰۃ:۱۴۵)

''تین اشخاص نبی ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھنے کے لیے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے پاس آئے۔ جب انہیں اس کے متعلق بتایا گیا' تو گویا انہوں نے اسے کم محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ہماری نبی ﷺ سے کیا نسبت؟ اللہ نے تو ان کی اگلی پچھلی تمام خطائیں معاف فرما دی ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا: میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں دن کے وقت ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا' اور تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے اجتناب کروں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ نبی ﷺ ان کے پاس آئے اور پوچھا: تم وہ لوگ ہو جنہوں نے اس طرح' اس طرح کہا ہے۔ اللہ کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ تقویٰ رکھتا ہوں' لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' رات کو نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں' پس جو شخص میری سُنّت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔''

بہت ہی خوب صورت اور تسلی بخش انداز میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کے توسط سے

اُمّت کو اعتدال کا پیغام دیا اور اپنی مثال دے کر بیان فرمایا تاکہ اس پر عمل کرنا' مشاہدہ کرنا' سیکھنا آسان ہو جائے۔ ایک حتمی نکتہ یوں بیان فرمایا کہ یہی میرا طریقہ ہے' یہی شریعت ہے اور اسی معتدل انداز میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ جو یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط کا شکار ہوگا' اس کا اُمّتِ مُسلمہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس اُمّت کی پہچان ہی اعتدال ہے۔

شریعت کا منہج و مزاج

شریعت یہ نہیں بتاتی کہ زندگی میں بیک وقت دین رہے گا یا دنیا رہے گی' یہ نہیں کہ اگر میں عبادت میں مگن رہا تو کسی سے تعلق نہیں رکھوں گا' نہ یہ کہ میں مکمل طور پر بازار سے چمٹ جاؤں یا پھر مسجد سے۔ شریعت بتاتی ہے کہ تم نے دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا ہے۔ تجارت بھی کرنی ہے اور عبادت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں۔ اللہ کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں اور اللہ کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تم اللہ کے حقوق ادا کرنے میں بندوں کے حقوق سے غافل ہو جاؤ اور نہ ایسا ہو کہ بندوں کی خدمت میں ہی لگے رہو اور خدا کی بندگی بھول جاؤ۔ تم مال کے لیے محنت ضرور کرو لیکن اسے اپنی ضرورت سمجھو' مقصد مت سمجھو ورنہ تم ''حُبِّ مال'' کی بیماری کا شکار ہو جاؤ گے۔ اسی طرح دنیاداری کرو لیکن اس کے لیے اتنی ہی کوشش کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنی کوشش کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے۔ اگر تم دنیا کی مختصر سی زندگی کے لیے آخرت والی محنت کرنا شروع کرو گے تو ''حُبِّ دنیا'' کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے' جسے رسول اللہ ﷺ تمام خرابیوں کی جڑ والی بیماری قرار دیتے ہیں۔

عقائد میں اعتدال کی تعلیم

ایک مسلمان کچھ اہم باتوں پر ایمان لے آتا ہے لیکن اسے یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ تمام عقائد ایک برابر نہیں بلکہ ان میں ایک ترتیب قائم ہے۔ مثلاً توحید کو عقائد میں سب سے پہلا درجہ حاصل ہے اور رسالت کو دوسرا۔ اب اگر کوئی عقیدۂ رسالت پر اتنا زور دے کہ اسے توحید سے بھی زیادہ اہم ثابت کرے تو یہ اعتدال کی پٹڑی سے ہٹ جانے والی بات ہے۔

عقائد میں اعتدال نہ ہونے کی ایک بڑی شکل یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کو اس درجہ شدّت سے بیان کیا جائے کہ اُمّت کے ہر دوسرے فرد کو مشرک سمجھنے لگے۔ توحید پر ایمان لانے کا یہ مطلب

ہرگز درست نہیں کہ اولیاء اللہ کی گستاخی کی جائے‘ ان کی کرامات کا انکار کیا جائے اور توحید کو سمجھانے کے بہانے اہل اللہ پر معاذ اللہ مزاحیہ جملے کسے جائیں۔ یہ توحید کے بیان کرنے کا طریقہ ہے نہ ہی دعوتی حکمت عملی کے موافق۔ بے شک توحید دین کا مرکزی ستون ہے اور شرک ایک گناہِ عظیم بلکہ ظلمِ عظیم ہے لیکن اس کی آڑ میں اسی توحید کے داعی صوفیاء اور اولیاء کی کردار کشی کرتے ہوئے سستے بازاری جملوں کا استعمال ان بزرگوں کے بالکل بھی شایانِ شان نہیں۔ یہ سب کے سب توحید کے حوالے سے اعتدال سے ہٹ جانے والے رویے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اور بزرگانِ دین کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق پیدا ہو جانا ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس کے بغیر دین کے بہت سے پہلو ادھورے رہ جاتے ہیں لیکن اپنے سوا ہر ایک کو گستاخ قرار دینا اور محبت و عقیدت کو اپنا ٹھیکہ سمجھ لینا غلط بات ہے۔ عقیدت کی آڑ میں اولیاء کو صحابہ سے بلند مرتبہ دینا یا انبیاء کو خدا کا مرتبہ دینا اور پھر عقیدت کی اوڑھنی اوڑھ کر شرک‘ بدعت کے دھندوں میں لگ جانا‘ اسلاف کے مدفن بیچ کھانا اور یہ سب عاشقِ رسول کا لیبل لگا کر کرنا‘ اس عقیدت کے سہارے خود کو عبادات سے یہ سوچ کر بری سمجھنا کہ یہی عقیدت میری نجات کے لیے کافی ہے‘ جہالت کی انتہا اور اُمّتِ مسلمہ کی اعتدال والی خصوصیت کے یکسر خلاف ہے۔

اس میں اعتدال کا طریقہ یہ ہے کہ توحید پر ایمان رکھے لیکن بزرگانِ دین کے مقام کو بھی سمجھے۔ رسالت پر ایمان رکھے لیکن عقیدت و محبت کا درست استعمال بھی سیکھے۔

تحریکات میں اعتدال کی ضرورت

اعتدال کا جنازہ نکالنے میں مختلف دینی تحریکات کے ناسمجھ کارکن بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ ہر ایک کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ دین کا کام اسی طرز پر کرنے کی ضرورت ہے جس پر ہماری تحریک کارفرما ہے۔ یہ بات ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دین کے مختلف شعبہ جات ہیں اور ان تمام کو ایک ساتھ کرنے کی خصوصیت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھی۔ قرآن آپ کے اوصاف و مناصب تلاوتِ کتاب‘ تعلیمِ کتاب‘ تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفس کی صورت میں بیان کرتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے جاتے ہی اُمّت کے پہلے طبقے یعنی صحابہ کی جماعت میں ہی یہ سارے کام خوب صورت انداز میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ٹھیک یہی ترتیب اُمّت کے موجودہ طبقے میں پائی جاتی ہے جو کہ سیاست‘ تعلیم و تعلّم‘ سلوک و تصوف‘ دعوت و تبلیغ‘ تحقیق‘ تصنیف و تالیف‘

جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ وغیرہ کی صورت میں اُمّت کر رہی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کام کو ناگزیر سمجھنا اور باقی سب کو بے کار یا کم اہمیت کا حامل سمجھنا یا پھر ہر ایک سے اپنی تحریک کے نظم کا تقاضا کرنا بے اعتدالی کے رویّے ہیں۔ ان سب کو اعتدال پر لانے کی یہی ایک صورت ہے کہ اُمّت کے کسی ایک شعبے پر لگ کر محنت کی جائے اور بقیہ کو اپنا حریف اور مخالف نہ سمجھا جائے۔

دین و دنیا میں اعتدال کی تعلیم

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟)) قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: ((فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ)) (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

وَفِي رِوَايَةٍ:

((فَارْجِعْ إِلَى وَالِدَيْكَ فَأَحْسِنْ صُحْبَتَهُمَا))(مشکوٰۃ:۳۸۱۷)

’’کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟‘‘ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

’’ان دونوں (کی خدمت) میں مجاہدہ (انتہائی کوشش) کر!‘‘

ایک دوسری روایت میں ہے:

’’اپنے والدین کے پاس چلا جا اور ان سے اچھی طرح سلوک کر۔‘‘

جہاد ایک بہت ہی عظیم عمل ہے لیکن اس صحابی کے لیے اس وقت اس کے والدین کی خدمت کرنا زیادہ عظیم عمل تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو والدین کی خدمت میں لگے رہنے کا حکم دیا۔ اس سے گویا شریعت کا یہ مزاج سمجھایا گیا کہ اس موقع پر دین پر عمل کرنے کی بہتر صورت کون سی ہے!

خالق اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں اعتدال

ایک ایسا شخص کہ جس کا گھر مسجد حرام کے اتنا قریب ہے کہ وہ گھر سے نکلے اور مسجد حرام میں پہنچ جائے۔ گھر میں اس کی والدہ بیمار ہیں اور انہیں تیمارداری کی ضرورت ہے۔ وہ مریضہ ایسی صورتِ حال کا شکار ہے کہ اگر کوئی اسے چھوڑ کر چلا جائے تو اس کی حالت مزید بگڑ سکتی ہے‘ ضرورت ہے کہ اس کے پاس کوئی نہ کوئی رہے۔ اسی دوران عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو اس کا

اکلوتا بیٹا اگر یہ کہے کہ میں مسجد حرام میں نماز پڑھوں تا کہ مجھے ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب ملے تو شریعت اس کے متعلق رہنمائی کرتی ہے کہ تم گھر میں ہی نماز پڑھو اور اپنی ماں کا خیال رکھو۔ اس موقع پر تمہارے لیے یہ زیادہ بہتر ہے۔

شریعت کی تعلیمات ایسی ہیں جو اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کے حوالے سے درمیانی راہ دکھلاتی ہے۔

انصاف اور اعتدال

ایک موقع پر کسی قبیلے کے جنگ وجدل کا معاملہ پیش آیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

((اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) قُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ، نَصَرْتُہٗ مَظْلُوْمًا، فَکَیْفَ اَنْصُرُہٗ ظَالِمًا؟ قَالَ: ((تَکُفُّہٗ عَنِ الظُّلْمِ فَذَاکَ نَصْرُکَ اِیَّاہُ))

(جامع الترمذی: ۲۲۵۵)

''اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ نے کہا: اللہ کے رسول! میں نے مظلوم ہونے کی صورت میں تو اس کی مدد کی لیکن ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا: ''اسے ظلم سے باز رکھو، اس کے لیے یہی تمہاری مدد ہے۔''

یعنی اگر تمہارا مسلمان بھائی ظلم کر رہا ہے تو تمہیں اس کا ساتھ یوں دینا ہے کہ اسے ظلم سے روکنا ہے اور اگر تمہارا بھائی مظلوم ہے تو اس کی بھی تمہیں مدد کرنی ہے اور ظلم سے بچانا ہے۔ شریعت نے دونوں کے متعلق احکامات سمجھا دیے کہ کس معاملے میں کون سا رویہ اپنانا ہے!

مال کمانے کے متعلق اعتدال

اگر کوئی کہے کہ میں کماتا ہی نہیں کیونکہ کمانا دنیاداری ہے اور میں دین دار بننا چاہتا ہوں تو یہ غلط رویہ ہے' کیونکہ حلال کمائی بھی دینی فرائض میں شامل ہے۔ کتنی ہی ایسی عبادات ہیں جو مال خرچ کر کے ادا کی جاتی ہیں جیسے زکوٰۃ' صدقہ' فطرہ' قربانی' حج' صلہ رحمی وغیرہ۔ اسی طرح اگر کوئی مال کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لے اور اس پر دولت جمع کرنے کی دھن سوار ہو جائے تو شریعت رہنمائی کرتی ہے کہ یہ بھی غلط طریقہ ہے۔ مال کو اللہ نے انسان کی خدمت وضرورت کے لیے پیدا کیا ہے' اپنے آپ کو اس پر کھپانے کے لیے نہیں۔ تم مال کماؤ اپنی ضرورت پوری

کرنے کے لیے' جب تمہاری ضرورت پوری ہو جائے تو مزید مال کو اپنا مقصد مت بناؤ۔

مال خرچ کرنے کے متعلق اعتدال

اگر کوئی اپنے مال کو بے تحاشا خرچ کرتا ہے تو شریعت منع کرتی ہے کہ فضول خرچی اور اسراف سے بچو۔ اگر کوئی اپنے مال کو خرچ ہی نہیں کرتا تو شریعت یہ کہتی ہے کہ کنجوسی سے بھی بچو۔ اللہ ربّ العزت ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾﴾

(الفرقان)

''اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں' نہ تنگی کرتے ہیں' بلکہ ان کا طریقہ اس (افراط وتفریط) کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے۔''

اللہ کریم ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ رحمان کے بندے وہ ہیں جو اعتدال اور میانہ روی پر قائم ہیں۔ خرچ کرنے میں افراط اور تفریط سے بچے ہوئے ہیں۔ جب فضول خرچی کرے گا تو گناہ اور عیاشی میں مبتلا ہو جائے گا اور بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ کر خریدنے کا بوجھ اٹھائے گا۔ اگر کنجوسی کرے گا تو زکوٰۃ' قربانی' حج' صدقہ خیرات' صلہ رحمی' اہل وعیال کے حقوق وغیرہ کیسے ادا کرے گا؟ اسی لیے شریعت نے اعتدال کی راہ دکھلائی کہ انفاق بھی کرنا ہے اور اسراف سے بھی بچنا ہے۔

نوافل اور فرائض کے درمیان اعتدال

فرائض وہ ہیں جو کسی حال میں معاف نہیں جبکہ نوافل کہتے ہی اس عبادت کو ہیں جو لازم نہیں بلکہ اضافی اجر وثواب کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس حوالے سے بھی بہت افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ ہم نوافل کو تو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ فرائض کو بھی نہیں دیتے' جیسے فضیلت والی راتیں آجاتی ہیں تو ان میں ساری رات عبادت کی جاتی ہے لیکن جب فجر کی فرض نماز ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو یہی نفلی عبادت کرنے والے سب سو جاتے ہیں۔ اس صورت میں نفلی عبادت کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے جس کے متعلق کوئی باز پرس نہیں ہوگی لیکن فرض کو چھوڑا جا رہا ہے حالانکہ قیامت کے دن پہلا سوال ہی فرض نماز سے متعلق ہوگا۔

قربانی کے موقع پر جو قربانی کرنے کا اردہ کرتے ہیں وہ یکم ذی الحجہ سے قربانی تک اپنے

ناخن اور جسم کے اضافی بالوں کو صاف نہیں کرتے جبکہ یہ ایک مستحب عمل ہے‘ یعنی جو یہ عمل کرے گا اسے ثواب ملے گا اور جو نہیں کرے گا اسے کوئی گناہ نہیں ملے گا۔ حیرت ہے کہ ایک شخص دس دن تک یہ نفلی کام کرتا رہتا ہے لیکن جیسے ہی قربانی کرتا ہے تو اپنی داڑھی کے بال بھی صاف کر دیتا ہے‘ حالانکہ داڑھی کاٹنا گناہِ کبیرہ ہے‘ مکروہِ تحریمی ہے۔ ایک طرف نفلی عبادت کی فکر ہے اور دوسری طرف حرام کی بھی فکر نہیں تو یہ افراط وتفریط ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا مزاج صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور دین کی جو حکمت والی درمیانی تعلیم ہے اس کو نہیں اختیار کیا گیا۔

قبور سے متعلق اعتدال

قبروں سے متعلق ہم دو انتہاؤں پر کھڑے ہوئے ہیں جبکہ شریعت یہاں بھی اعتدال ہی سکھاتی ہے۔ مثلاً میت کو غسل دیتے وقت اعضاء کا خیال رکھو‘ زیادہ ٹھنڈا اور زیادہ گرم پانی کے بجائے نیم گرم پانی کا استعمال کرو‘ تدفین کے وقت اعزاز سے رکھو‘ جنازہ پڑھو‘ کندھا دو اور جب دفن کر لو تو قبر پر قدم مت رکھو‘ قبر کو اپنی نشست گاہ مت بناؤ‘ قبر کو مسمار مت کرو۔ یہ سب مرحوم کے لیے احترام کی ایک معتدل شکل ہے۔

اسی طرح شریعت یہ بھی بتلاتی ہے کہ حد سے بڑھ جانے والے کام بھی نہ کرو۔ قبر کی پختہ تعمیر مت کرو‘ مزار مت بناؤ‘ چراغ مت جلاؤ‘ قبر کا طواف نہ کرو نہ ہی اسے سجدہ گاہ بناؤ‘ نہ صاحبِ قبر سے دعا مانگو وغیرہ۔ گویا دونوں چیزیں ساتھ ساتھ سمجھا دیں کہ تم حد سے بڑھنے کی کوشش بھی مت کرو اور حد سے گرنے کی کوشش بھی مت کرو۔

شادی بیاہ کے موقع پر اعتدال

جب یہ کہا جاتا ہے کہ شادی شریعت کے مطابق کرو تو ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شریعت کے مطابق شادی شاید سوگ منانے جیسا عمل ہے۔ اگر شادی شریعت کے مطابق ہوگی تو تسبیح پڑھنی ہوگی‘ قرآن خوانی یا آیت کریمہ کا ختم کرنا ہوگا اور پھر ایسا لگے گا کہ خوشی کا ماحول ہی نہیں ہے۔ درحقیقت ایسا بالکل نہیں ہے۔ شادی ایک خوشی کا موقع ہے اور اسے خوشی خوشی ہی منانا چاہیے۔ خوشی منانے کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس سے منع نہیں کیا جا رہا البتہ چند شرائط بتائی جا رہی ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے۔ مثلاً بے پردگی نہ ہو‘ ڈھول باجے نہ ہوں‘

ہندوانہ رسم ورواج نہ ہوں۔ ان شرائط کے ساتھ جیسے چاہو اپنی خوشی منا لو۔ آپ ﷺ خود اس کی ترغیب دے رہے ہیں کہ نکاح کی تقریب کا بھرے مجمع میں اہتمام کرو‘ مسجد میں نکاح کرو‘ ولیمہ کر کے سب کو اپنی خوشی میں شریک کرو‘ وغیرہ وغیرہ۔

باہمی تعلقات میں اعتدال

اکثر ہمارے آپس کے تعلقات میں بھی افراط وتفریط کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کسی سے ایسا تعلق قائم کریں گے کہ اس پر جان بھی نثار کریں گے۔ ہر وقت اسی کے ساتھ بیٹھک لگائیں گے‘ گپ شپ لگی رہے گی۔ وقت بے وقت یار کو ڈھونڈتے رہیں گے۔ کہیں آنا جانا‘ تقریبات میں شرکت کرنا‘ یہاں تک کہ لین دین بھی اسی کے ساتھ کرنے کا سوچیں گے۔ اگر ایک اختلاف سے یہ گہری دوستی دشمنی میں بدل جائے تو پھر ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے تعلقات میں پائی جانے والی بڑی عام بے اعتدالی ہے۔

شریعت یہ نہیں کہتی کہ ہم ہر ایک سے دوستیاں کرتے پھریں‘ ہر ایک کو اپنے سر کا تاج بنا لیں اور ہر ایک سے لین دین شروع کر دیں بلکہ جو روش اپنانی چاہیے اس کے متعلق فرمایا کہ ایک مسلمان کی مال‘ جان‘ عزت وآبرو کی حفاظت کرو۔ اس کے ساتھ علیک سلیک رکھو۔ ضرورت پڑنے پر اس کی مدد کرو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔

کسی سے ایسی دوستی کرنا کہ اس کے غلط کو بھی صحیح قرار دینا اور کسی سے ایسی نفرت کرنا کہ اس کی ساری اچھائیاں نظر انداز کرنا‘ دونوں رویے غلط ہیں۔ اگر ہم کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اس میں خوبی بھی ہو سکتی ہے اور خامی بھی تو ہم اس کی خوبی پر نظر رکھیں اور اس کی خامی کو نظر انداز کریں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے تعلقات میں بھی اعتدال کا لحاظ رکھیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی ایک اختلاف کی وجہ سے ہم تعلق کو دشمنی میں بدل دیں۔ یہ بڑے ظلم کی بات ہے۔

مزاج کا اعتدال

کوئی اپنے مزاج میں اتنی زیادہ بہادری رکھتا ہے کہ وہ ظالم بن جاتا ہے تو شریعت اس رویے کی مذمت کرتی ہے۔ اگر کوئی اپنے مزاج میں اتنا ڈھیلا پن لاتا ہے کہ بالکل بزدل ہی بن جاتا ہے تو شریعت اس رویے کی بھی ممانعت کرتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس قدر احساس کمتری کا شکار ہے کہ وہ ناشکری میں مبتلا ہونے لگتا ہے تو شریعت کہتی ہے کہ یہ ناشکری تمہیں اللہ

کی رحمت سے مایوس کر کے کفر کے کنویں میں دھکیل سکتی ہے۔ کوئی بہت زیادہ احساس برتری کا شکار ہے جس سے گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا ہو رہا ہے تو شریعت اس رویے کی بھی روک تھام کرتی ہے کہ تم اپنے اندر تواضع اور عاجزی پیدا کرو۔ خود کو بہت گھٹیا بھی مت سمجھو اور بہت اعلیٰ بھی مت سمجھو۔ اپنے اندر عاجزی کی روش پیدا کر کے اعتدال پر قائم رہو۔

عقل اور جذبات میں میانہ روی

انسان میں عقل اور جذبات کے بڑے شدید مادے پائے جاتے ہیں جو اکثر اوقات انسان کو اعتدال پر قائم رہنے نہیں دیتے۔ زیر بحث آیت کی روشنی میں یہ اہم اصول سمجھنے کو ملتا ہے کہ تم اُمّت وسط ہو۔ دین کا مزاج اور دین کی جو اصل بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی ہے' اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اپنے جذبات اور عقل کو بیچ میں مت لاؤ کیونکہ انسان ایسا ہے کہ کبھی وہ جذبات میں آ کر غلط فیصلہ کرتا ہے' اور کبھی اپنی عقل کے خودساختہ پھندے میں پھنس کر ناقص فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس لیے اس اُمّت کو سمجھایا گیا کہ فیصلے اپنی طبیعت کے مطابق مت کرو بلکہ جیسے شریعت رہنمائی کرے ویسے فیصلے کرو چاہے تمہاری عقل میں آئے یا نہ آئے' تمہارا دل مانے یا نہ مانے۔ جب تم اپنے آپ کو شریعت کے حوالے کرو گے تو وہ تمہیں نہ حد سے آگے بڑھنے دے گی نہ حد سے گرنے دے گی کیونکہ شریعت میں اعتدال پایا جاتا ہے۔

خلاصہ

ہمارے ہر عمل میں اعتدال کی ضرورت ہے۔ عقیدے میں بھی' عبادت میں بھی' حقوق کی ادائیگی میں بھی' خرچ میں بھی' سیاست میں بھی' نیکیوں میں بھی' آپس کے تعلقات میں بھی' ہمارے مزاج اور اہم فیصلوں میں بھی اعتدال ہونا چاہیے تاکہ ہم اُمّتِ مُسلمہ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

❁ ❁ ❁

اطلاع برائے قارئین

قارئین نوٹ فرمالیں کہ پیش نظر شمارہ کی حیثیت
مارچ اپریل کی مشترکہ اشاعت کی ہے!

عمر رسیدہ افراد کے لیے لمحۂ فکریہ

ممتاز ہاشمی

اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جب انسان ساری عمر دنیاوی جِدّ و جُہد میں مصروف رہنے یعنی پڑھنے لکھنے اور نوکری یا کاروبار میں گزارنے کے بعد ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس کو مختلف حالات و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے روزمرہ کے معمولات میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں' جن کی قبولیت میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مواقع پر اکثر لوگ یہ مشورہ دیتے کہ مصروفیت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ اپنایا جائے یا کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے خود کو مصروف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

درحقیقت زندگی کے اس اہم اور نازک موڑ پر فرصت کے لمحات کی صورت میں اللہ تعالیٰ ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم اپنے ماضی کو پرکھیں اور اس سے سبق حاصل کرتے ہوئے بقیہ زندگی کا لائحۂ عمل ترتیب دیں۔ اگر گزر اوقات کے لیے اسباب میسر نہ ہوں تو زندہ رہنے کے لیے کام کرنا بھی عبادت میں شامل ہے۔ اگر ہمارے پاس سادگی سے زندہ رہنے کے لیے اسباب میسر ہیں تو اپنے وقت اور صلاحیتوں کو اللہ کی بندگی کے لیے وقف کرنا ہی ہمارے لیے کامیابی کی امید ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے طرزِ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی ضروریات کو کم کرنے پر غور کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ غیر ضروری معاملات کو چھوڑنے اور ان سے بچنے والے وقت' مال اور صلاحیتوں کو اللہ کی بندگی کے لیے وقف کیا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ شامل کیا ہے کہ جب وہ اللہ کی طرف راغب ہوتا ہے اور ایمان بالیقین کی کیفیت میں داخل ہوتا جاتا ہے تو اس کی دنیاوی زندگی میں خود بخود عاجزی' انکساری اور سادگی بڑھتی جاتی ہے۔ یہی پیمانہ ہے ہر ایک لیے اپنے ایمان کے دعوے کو جانچنے کا۔

ہم میں سے اکثریت اس بات سے غافل ہوتی ہے کہ اس عمر تک پہنچ جانے کے بعد اللہ

کے احکامات اور حکمت عملی کیا ہے۔ عمر کے اس حصے میں انسان جسمانی اور ذہنی طور پر اس قدر تندرست و توانا نہیں ہوتا جو وہ جوانی کی عمر میں تھا۔ عمر رسیدہ افراد کے لیے کیا لائحۂ عمل ترتیب دینے کی ضرورت ہے' اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن اور سنّت ہی سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَعْمَارُ اُمَّتِي مَا بَيْنَ السِّتِّينَ اِلَى السَّبْعِينَ' وَاَقَلُّهُمْ مَنْ يَجُوزُ ذٰلِكَ))

(ترمذی: ۳۵۵۰۔ ابن ماجہ: ۶۲۳۴)

''میری اُمّت کی عمریں ساٹھ اور ستّر کے درمیان ہوں گی' اور اس سے تجاوز کرنے والے لوگ بہت کم ہوں گے۔''

اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے' دینِ اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے ساٹھ سال کا عرصہ کافی طویل ہے۔ اس لیے جو بندے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کے عذر' حُجّت اور بہانے کو ختم کر دیتا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۶۷﴾ (غافر)

''وہی ہے (اللہ) جس نے تمہیں پیدا کیا پہلے مٹی سے' پھر نطفے سے' پھر علقہ سے' پھر وہ تمہیں بچہ بنا کر نکالتا ہے' پھر (تمہیں پروان چڑھاتا ہے) تاکہ تم اپنی پوری قوت (جوانی) کو پہنچ جاؤ' پھر (تمہیں مزید عمر دیتا ہے) تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ۔ (جبکہ) تم میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہیں اس سے پہلے ہی وفات دے دی جاتی ہے اور (تم میں بعض کو مہلت دیتا ہے) تاکہ تم وقت مقررہ تک پہنچ جاؤ' اور (یہ اس لیے ہے) تاکہ تم سمجھو۔''

یہاں وقتِ مقررہ سے مراد موت کا وقت ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں شکمِ مادر میں تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل' پھر دنیا میں انسانی زندگی کے مختلف اَدوار کا بیان کر کے یہ بتادیا ہے کہ جس شخص کو بچپن اور جوانی سے گزارتے ہوئے بڑھاپے میں پہنچا دیا جائے اس کے لیے اپنے رب کو نہ پہچاننے کی کوئی حجت باقی نہیں رہتی' اگر وہ سوچ سمجھ سے کام لے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

((اَعْذَرَ اللّٰہُ اِلَی امْرِئٍ اَخَّرَ اَجَلَہٗ حَتّٰی بَلَّغَہٗ سِتِّیْنَ سَنَۃً))

(صحیح البخاری:۶۴۱۹)

''اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے لیے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رکھا جس کو ساٹھ برس تک (دنیا میں) مہلت دی۔''

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال تک کی لمبی عمر عطا کی اور اتنے طویل زمانہ تک اس کو مہلت دی' اس کے باوجود وہ توبہ کر کے گناہوں سے باز نہیں آتا اور اب بھی اپنے رب کریم کی طرف رجوع نہیں کرتا تو پھر اس کے لیے عذر خواہی کا وہ کون سا موقع رہ گیا ہے جس کے سہارے وہ قیامت کے دن عفو و بخشش کی امید رکھتا ہے! اگر کوئی جوان شخص گناہ و معصیت اور بے عملی کی راہ اختیار کیے ہوئے ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا تو اپنی بدعملیوں اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے زندگی کے اس حصہ کو اللہ کی رضا جوئی اور اس کی عبادت میں صرف کروں گا' لیکن جو شخص بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا ہے اس کے ہاتھ سے توبہ و انابت اور نیک عمل کرنے کا آخری موقع بھی نکلا جا رہا ہے۔ ایسے میں وہ اپنی بے عملی اور گناہوں پر اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دے گا؟

کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو عمر کی آخری منزل میں پہنچ کر بھی اپنی بے عملیوں اور اپنے گناہوں پر نادم و شرمسار نہیں ہیں! اس آخری مرحلہ پر بھی جب کہ موت آدبوچنے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہے' انہیں اپنے رحیم و کریم پروردگار کا دامن عفو و رحمت پکڑ لینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ جب اسی حالت میں ایسے لوگوں کی موت واقع ہو جاتی ہے تو جہنم ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ ان کے لیے یہ آخری موقع ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے اپنی بقایا زندگی کو اللہ کی عبادت میں گزارنے کا عہد کریں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرصت یا مہلت ہمیں مہیا کی ہے تو یہ اس کا ہم پر بہت بڑا کرم ہے۔ وہ اب بھی ہمیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے کہ قرآن کی طرف لوٹ آئیں۔ اپنے مقصدِ حیات کو کامیاب بنانے کے لیے اللہ کے احکامات کی پابندی اور اس کے دین کے نفاذ کے لیے عملی جدّوجُہد میں حصہ لیا جائے۔ اس عظیم مقصد اور اس کے حصول کے لیے عملی لائحۂ عمل کو مفکّرِ قرآن علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

(باقی صفحہ 146 پر)

مسلمانانِ ہند کا مقدّمہ

ارسلان اللہ خان ☆

ہم پاکستانی بچپن سے یہ سنتے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں پر کشمیر‘ بوسنیا اور فلسطین میں ظلم ہو رہا ہے اور واقعتاً یہ حقیقت بھی ہے۔ پھر چیچنیا اور روہنگیا کے مسلمانوں کے لیے بھی منبر و محراب سے دُعائیں بلند ہوئیں اور اللہ کے فضل سے اب ان دونوں جگہوں پر معاملات بہتر ہیں۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا ہے جس پر مسلمانانِ پاکستان نے خال خال ہی آواز اُٹھائی ہے اور وہ ہے مسلمانانِ ہند کا مسئلہ۔ اس ضمن میں یقیناً پاکستان کے بہت سے علماء نے آواز اُٹھائی ہوگی لیکن مجموعی طور پر ہماری مساجد اور مدارس جو کہ اسلام کے قلعے ہیں‘ وہ بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کوئی خاطر خواہ آواز بلند کرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت ہی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان حالات کشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ پاکستان بننے کی قیمت تو شمالی ہندوستان کے اُن مسلمانوں نے دی ہے جن بے چاروں کو یہ شرح صدر تھا کہ اُن کے علاقے کسی بھی اعتبار سے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ پھر بھی اُنہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا‘ جس کا خمیازہ وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دل میں ہندوستان کے مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپؒ نے اُس وقت ہندو انتہا پسند تنظیموں کے خطرناک عزائم کو بے نقاب کیا جب اس کی بابت بہت کم لوگ علم رکھتے تھے۔ آپؒ نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ جس دن آر ایس ایس کی گود میں پلنے والی ہندو انتہا پسند تنظیم بی جے پی اقتدار میں آئے گی وہ مساجد کو شہید کرے گی اور مسلمانانِ ہند کے لیے عرصۂ حیات تنگ کرے گی۔ آج یہ سب ہم اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بتا دیا تھا کہ ہندوستان میں انتہا پسندی کا گڑھ مہاراشٹر ہے اور جملہ انتہا پسند ہندو

☆ای میل: khanarsalanullah786@gmail.com

تنظیمیں وہیں سے ہیں خواہ وہ ویشوا ہندو پریشد ہو‘ شیوسینا ہو یا بجرنگ دل ہو۔ ان کی فکر مرہٹہ چھاپہ مار شیواجی کی طرز پر ہے جنہوں نے مغلوں کا جینا حرام کر دیا تھا‘ یہاں تک کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالیؒ کو خط لکھا کہ آپ ان مرہٹوں سے ہماری جان بخشی کرائیں۔ پھر پانی پت کی تیسری جنگ میں اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے احمد شاہ ابدالیؒ کے ذریعے مرہٹوں کا صفایا ہوا۔ اگر یہ جنگ نہ ہوئی ہوتی تو مرہٹے پورے ہندوستان پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیتے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ رام جی کی جنم بھومی (یعنی جائے پیدائش) کے بارے میں ہندو دھرم خاموش تھا لیکن پھر عیار اور مکّار عیسائیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ڈالنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا کہ مغل بادشاہ بابر نے رام جی کی جنم بھومی کی جگہ پر موجود مندر کو توڑ کر بابری مسجد بنائی تھی۔ عجیب بات ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں نے فوراً انگریزوں کی اس بات کو اس طرح مان لیا جیسے انگریز اُن کے بھگوان ہوں۔ جو بات ہندوؤں کی مقدّس کتب پران‘ رامائن‘ وید‘ بھگوت گیتا اور مہابھارت میں بھی نہیں تھی وہ تیسرے ٹھکانے یعنی عیسائیوں کی تحقیق کے تحت فوراً مان لی گئی۔ ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انہوں نے انگریزوں کی غلامی اور اُن کے دور میں ہونے والے مظالم یکسر فراموش کر کے اُنہیں معاف کر دیا ہے اور اب اُن کی اگر کسی سے دُشمنی ہے تو وہ مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں ایک عیسائی نے دعویٰ کیا ہے کہ تاج محل تیجو مندر کے اوپر بنا ہے اور یہ سنتے ہی انتہا پسند ہندو اب تاج محل کی جانب بھی بڑھ رہے ہیں۔ پہلے تو ہندو عیسائیوں کی بات پر عمل کر کے کوئی کارروائی کرتے تھے لیکن اب فرعونِ ہندوستان مودی‘ اَمیت شاہ اور یوگی نے تو ظلم و بربریت کی تمام حدوں کو عبور کر لیا ہے۔ آج کوئی بھی ایرا غیرا ہندو تھانے جا کر اگر یہ کہہ دے کہ مجھے شک ہے فلاں مسجد ایک مندر توڑ کر بنائی گئی ہے تو اُسی وقت ہندو پولیس اُس مسجد کا سروے رکھ دیتی ہے۔ مسلمان بیچ میں آتے ہیں تو اُنہیں مارا جاتا ہے۔ پھر کورٹ اُس جگہ کو متنازع قرار دے دیتی ہے اور وہ مسجد بند کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ ہی دنوں میں مسجد کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح ہندوؤں نے عیسائیوں کی بات پر یقین کر کے بابری مسجد شہید کر کے اُس کی جگہ رام مندر بنایا ہے اس سے ہندو عیسائی گٹھ جوڑ کی حکمتِ عملی واضح ہے۔ دوسری جانب

ہندوستان کی اسرائیل سے دوستی اور موساد اور را کا مل کر کام کرنا یہود و ہنود ملاپ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے تو ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کفر ایک ہی ملت ہے لیکن افسوس ہم مسلمان نہ اس بات کو سمجھے اور نہ ایک ہو سکے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں کے احتجاج پر ہندوستان بھر میں مسلم کش فسادات ہوئے۔ اس کے بعد مساجد اور مزارات شہید کرنے کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

اب ہندوستان کی گیان پوری مسجد اور پھر سنبھل مسجد کو شہید کیا جا رہا ہے۔ آج ''جے شری رام'' کا نعرہ نفرت' امن کے خاتمے اور مسلمانوں کے قتل عام کا نعرہ بن چکا ہے۔ یہی نہیں' اب تو نوبت بہ ایں جا رسید کہ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے دربار کو بھی (معاذ اللہ) مسمار کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ رام جی کے پیروکار آج انہی کی بات سننے کو تیار نہیں۔ وہ رام جی کا نام لے کر مسلمانوں کو شہید تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی امن پسندی اور اہنسا یعنی عدم تشدد کی حکمتِ عملی پر عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ انتہا پسند ہندو رام جی کے نام کی مالا جپ کر راون سے جا ملے ہیں۔ اُنہیں امن و امان' حق پرستی اور شانتی کے حوالے سے رام جی کی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ''جے شری رام'' کے نعرے لگا لگا کر مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہیں' اُن کے گھروں کو مسمار کرتے رہیں' مساجد کو مندروں میں تبدیل کرتے رہیں۔

اس سارے قضیے میں سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی مساجد میں جمعہ کی نماز کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سرے سے کوئی دُعا نہیں کی جاتی۔ دوسری جانب ہمارے وزیرِ دفاع صاحب محمود غزنویؒ کو لٹیرا کہہ رہے ہیں۔ سندھ میں راجا داہر کو ہیرو جبکہ محمد بن قاسمؒ کو غاصب کہا جا رہا ہے۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ اور بھگت سنگھ کے ناموں کو ثقافت کے نام پر زندہ کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں سہیل وڑائچ نے اپنے ایک کالم میں بتایا ہے کہ ہندوؤں کے قدیم کٹاس راج مندروں کو ازسرِنو تعمیر کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف ہندوستان کے ہمارے مسلمان بھائی ہیں جو بے بسی کے عالَم میں ہماری طرف دیکھ رہے ہیں اور دوسری جانب ہماری بے اعتنائی اپنے عروج پر ہے۔ یہاں تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ ہم نے اپنی نوازشوں اور کرم کو رواداری کے نام پر اغیار کے لیے وقف کر لیا ہے جبکہ ہمارا غصّہ' نفرت اور انتقام اپنے مسلم بھائیوں کے لیے ہی رہ گیا ہے۔ ہم اپنی سیاسی اور عسکری قیادت کو کیا کہیں جب پاکستان کے منبر

و محراب ہی سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہ کوئی دُعا کی جاتی ہے نہ کوئی بات۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کے تمام طبقات کے مسلمان اپنی اپنی بساط کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آواز بلند کریں۔ اس ضمن میں پرنٹ' الیکٹرانک اور سوشل میڈیا اپنا کردار ادا کرے۔ پُرامن احتجاجی ریلیاں نکالی جائیں۔ او آئی سی کو خط لکھا جائے بلکہ جس طرح ہندوستان میں مساجد ایک کے بعد ایک شہید کی جا رہی ہیں' اس پر تو او آئی سی کا مرکزی اجلاس فوری طور پر بلانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کہا کرتے تھے کہ اگر مسلمانانِ پاکستان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیا تو ہم سب اُن کے مجرم ہوں گے۔ آج جس طرح عرب ممالک نے فلسطین کو تنہا چھوڑ دیا ہے اسی طرح اب ہمارے یہاں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جذبہ ماند پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر مسجد میں مسلمانانِ ہند کے لیے دُعائیں مانگی جائیں۔ ہندوؤں کے مظالم کو ہر ممکن طریقہ اور ذریعہ سے طشت از بام کیا جائے۔ بقول اقبالؒ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

❁❁❁

بقیہ: عمر رسیدہ افراد کے لیے لمحۂ فکریہ

وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اکثر اقبال کے اس شعر کو سناتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد مکمل ہو چکا ہے' جبکہ درحقیقت ابھی ایسا نہیں ہوا۔ اس کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب کُرّۂ ارض پر اللہ کا دین غالب اور نافذ ہو جائے گا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فریضہ تمام اہلِ ایمان پر فرضِ اوّلین ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ہدایت عطا فرمائے اور اپنی بقایا زندگی اللہ کی عبادت یعنی دینِ اسلام کے نفاذ کی جِدّوجُہد میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

Mar. 2025
Vol.74

Regd. CPL No.115
No.3

Monthly Meesaq Lahore

داعیٔ رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

- خوبصورت قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- عمدہ امپورٹڈ کاغذ
- معیاری طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)